प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

ALI AHMED FATIMI KE SAFAR NAMOUN KA MUTALA

A Dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by

MOHD SHAMEEM

Reg. No. 19HUHL09

Supervisor

Prof. Habib Nissar

UNIVERSITY OF HYDERABAD
सा विद्या या विमुक्तये

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
Telangana, India

February 2022

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

محمد شمیم

19HUHL09

نگراں

پروفیسر حبیب نثار

UNIVERSITY OF HYDERABAD
सा विद्या या विमुक्तये

شعبۂ اُردو
اسکول آف ہیومانیٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد 500046
تلنگانہ، انڈیا

فروری ۲۰۲۲ء

Date: 22/02/2022

DECLARATION

I, **MOHD SHAMEEM** hereby declare that this dissertation entitled **"ALI AHMED FATIMI KE SAFAR NAMOUN KA MUTALA"** submitted by me under the guidance and supervision of **Prof. Habib Nissar,** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodganga / INFLIBNET.

Name: **MOHD SHAMEEM**

Signature of the Student

Reg. No. 19HUHL09

Date: 22/02/2022

<u>CERTIFICATE</u>

This is to certify that the dissertation entitled **"ALI AHMED FATIMI KE SAFAR NAMOUN KA MUTALA"** submitted by **MOHD SHAMEEM** bearing Registration No. **19HUHL09** in partial fulfillment of the requirements for the award of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

This is also to certify that **MOHD SHAMEEM** participated in the Two-Day National Seminar on *"Genre of Urdu Prose"* held on 18^{th} & 19^{th} March 2021. He has presented the paper titled ***"Urdu Mein Safar Nama"*** Organized by Department of Urdu, Govt. Degree College (W) Hussaini Alam, Hyderabad, Telangana.

Signature of the Supervisor
Prof. Habib Nissar

//Countersigned//

Head
Department of Urdu

Dean
School of Humanities

GOVT. DEGREE COLLEGE (W)
HUSSAINI ALAM, HYDERABAD, T.S

گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین
حسینی علم حیدرآباد، تلنگانہ

دوروزہ قومی سیمینار بعنوان: اردو کی نثری اصناف

Two-day National Seminar on **"GENRE OF URDU PROSE"** held on 18th & 19th March 2021

Sponsored by: NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE (NCPUL), New Delhi
in Collaboration with TELANGANA STATE URDU ACADEMY

Organized by: DEPARTMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that Dr./Mr./Ms. MOHD. SHAMEEM - محمد شمیم

of Dept. of Urdu, Hyderabad Central University, Research Scholar *has presided/attended as resource person/participated/presented a paper titled* "Urdu Mein Safar Nama" "اردو میں سفرنامہ"

in Two-day National Seminar in GENRE OF URDU PROSE held on 18th & 19th March 2021.

Dr. Abdul Quddus
Convener

Dr. B. Sunitha Padmavathi
Principal

Sl No. 15255

Notification No. 2

हैदराबाद विश्वविद्यालय

UNIVERSITY OF HYDERABAD

(A Central University Established by an Act of Parliament)

P.O. CENTRAL UNIVERSITY, GACHIBOWLI, HYDERABAD - 500 046 (INDIA)

SEMESTER GRADE TRANSCRIPT

REGULAR EXAMINATION

REG. NO. **19HUHL09**

NAME OF THE STUDENT **MOHD SHAMEEM**

MONTH AND YEAR OF EXAM **NOV 2019** **SEMESTER 1**

COURSE **M.Phil. URDU**

PARENT'S NAME **MOHD MUSTAFA / SHAHJAHAN BANO**

COURSE NO	TITLE OF THE COURSE	GRADE	CREDITS	RESULTS
UR701	RESEARCH METHODOLOGY	B	4	PASS
UR702	PRACTICAL CRITICISM	B+	4	PASS
UR721	TEXTUAL CRITICISM	A	4	PASS

SEMESTER GRADE POINT AVERAGE (SGPA) :**8.00**

(In words) :EIGHT POINT ZERO ZERO

Date Of Result Notification : **Dec 17, 2019**

Pattern of Evaluation is based on 6 letter grades on a 10 point scale.

LETTER GRADE	A+	A	B+	B	C	F
CREDITS	10	9	8	7	6	0

Date Of Download : **Aug 18, 2020**

DEPUTY REGISTRAR
(ACAD & EXAMS)

This is system generated certificate issued by O/o The Controller of Examinations, University of Hyderabad

پروفیسر علی احمد فاطمی

فہـــرست ابــواب

- پیش لفظ 02
- باب اول: علی احمد فاطمی: حیات، شخصیت اور کارنامے 07
- باب دوم: سفرناموں کی روایت 33
- باب سوم: علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا مطالعہ 101
- ماحصل 186
- کتابیات 193

پیش لفظ

پیش لفظ

مدت سے آرزو تھی ہمیں خواب دیکھنے کی
سو اپنی زندگی میں نئے خواب بھر رہے ہیں

الحمدللہ میرے ایم۔فل کا تحقیقی مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا اور سب سے پہلے میں اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیوں کہ اس کے ہی فضل وکرم سے یہ مشکل مرحلہ آسانی سے طے ہوا۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی تحقیقی وعلمی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا، اس میں تشنگی باقی رہتی ہے۔لہٰذا حتی الامکان کوششوں کے باوجود مقالے میں کسی بھی فروگذاشت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ایم۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دل میں یہ امنگ پیدا ہوئی کہ تحقیق کے میدان کی بھی سیر کر لی جائے۔ چنانچہ میں نے شعبۂ اردو سینٹرل یونیورسٹی حیدرآباد میں ایم۔فل میں داخلہ لیا۔کورس ورک شروع ہونے پر معلوم ہوا کہ تحقیق کے میدان کی سیر آسان نہیں۔ یہاں محنت اور صبر وتحمل کے ہتھیار ہی کام آتے ہیں۔ایم فل میں کسی موضوع پر مقالہ سپرد قلم کرنا ہوتا ہے۔ جب موضوع کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا تو میں بھی تشویش میں تھا کہ آخر کس موضوع کو اپنی ابتدائی تحقیق کا مقدر سمجھوں۔ بالآخر الہ آباد کے مشہور ترقی پسند ناقد، فکشن نگار و سفرنامہ نگار علی احمد فاطمی کا نام تجویز کیا۔

استادمحترم پروفیسر حبیب نثار صاحب نے میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میرے اس تحقیقی مقالے کا عنوان ''علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا مطالعہ'' طے کیا۔ میں حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کے تمام اساتذہ کا ممنون و متشکر ہوں کہ انھوں نے مجھے اس موضوع پر کام کرنے کی اجازت دی اور تمام سہولیات سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔

راقم الحروف نے اس مقالے کو اپنے نگراں کے مشورے سے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل علی احمد

فاطمی کی حیات،شخصیت اور کارنامے سے متعلق ہے جس میں ان کے آباء واجداد، والدین، ولادت، بچپن اور تعلیم وتربیت،شادی، ملازمت،تصانیف اوران کی سیرت وشخصیت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دو میں سفرناموں کی روایت کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے اور سفرنامے کے فن پر بحث کرتے ہوئے اس کی تعریف، بنیادی عناصر،اغراض ومقاصد،اہمیت وافادیت اورادبی قدر وقیمت کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔

باب سوم میں علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔یہ مقالے کا اہم اورمرکزی باب ہے،جس میں ان کے سفرناموں کے فنی وفکری اوصاف کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے۔آخر میں ماحصل کے طور پر مجموعی جائزہ پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔اس کے بعد ان کتب ورسائل کی فہرست دی گئی ہے،جن کے زیراثر مقالے کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔

سفراورانسان آپس میں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔دنیا کی پوری زندگی درحقیقت ایک سفر ہے، ایسا سفر جس کی انتہا کسی کو معلوم نہیں۔سفر روزِ اوّل سے ہی انسان کا مقدر رہا ہے۔تلاش وجستجو وہ جبلی قوت ہے، جوانسان کوتہذیب وتمدن کا ارتقائی سفر جاری رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔اس خواہش کی تحریری تکمیل کوادبی زبان میں سفرنامہ کہا جاتا ہے۔سفرنامہ غیر افسانوی ادب کی وہ پرکشش بیانیہ صنف ہے،جس میں مسافر دوران سفر پیش آنے والے حادثات وواقعات،مشاہدات وتجربات اوراحوال وکوائف کا ذکر کرتا ہے اورتمام حالات سفر کواس طرح قلم بند کرتا ہے کہ قاری کی نظروں میں سفر کے سارے مناظر سما جائیں۔جنھیں پڑھ کر وہ یہ گمان کرنے لگے کہ گویا وہ بھی اس سفر کا ایک حصہ ہے۔سفرنامہ کئی معنوں میں اردو کی مقبول صنف ہے۔بچپن سے ہی مجھے سفر کی روداد سننے کا شوق تھا۔وقت کے ساتھ ساتھ جب سیروسیاحت کا بھی شوق بڑھا تواس کی تکمیل اردوسفرناموں کے مطالعے سے ہوئی۔خوش قسمتی سے مجھے ایسے استاد کی سرپرستی حاصل ہوئی جنھوں نے میرے اس شوق کو تحقیق کی طرف موڑ دیا ہے۔

مقالہ لکھنا بہ ظاہر آسان نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مواد کی فراہمی ترتیب وتدوین کا مرحلہ مشکل ہوتا ہے اور مقالہ نگار کے لیے یہ مرحلہ جوئے شیر لانے کے مماثل ہوتا ہے۔ایسے میں اساتذہ کی شفقت،احباب کا دست تعاون اور نگراں کی رہنمائی ورہبری مقالہ نگار کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوتی ہے۔یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے بھی اساتذہ کی شفقتیں،نگراں کی رہنمائی ورہبری اوراحباب کا تعاون مقالے کے ہر مرحلے میں میسر ہوا۔

میں سب سے پہلے اپنے استاد و نگراں پروفیسر حبیب نثار صاحب کا بے انتہا متشکر و ممنون ہوں کہ جنھوں نے نہ صرف میری سر پرستی کی بلکہ مجھے پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے کی اجازت بھی دی۔ میں اپنے مربی استاد پروفیسر حبیب نثار صاحب کا بیحد شکر گزار ہوں کہ ان کی مشفقانہ سر پرستی میں یہ مقالہ لکھا۔ بلاشبہ استاد محترم کی توجہ اور قدم بہ قدم رہنمائی کے بغیر یہ حوصلہ شکن کام انجام پذیر نہ ہوتا۔ ابتدائی مراحل سے لے کر مقالے کی تکمیل تک آپ نے قیمتی و مفید مشوروں سے نوازا اور میری اصلاح کی۔ اس ناچیز کی خوش نصیبی ہے کہ آپ جیسے شفیق استاد کے زیر نگرانی رہ کر علم و ادب کے رموز و نکات کے ساتھ آدابِ زندگی کی تفہیم کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ مجھ پر میرے استاد کا سایہ سلامت رہے، مجھے ہمیشہ ان کی شفقتیں نصیب ہوتی رہیں۔ رب انھیں اپنی امان میں رکھے اور ہم جیسے نہ جانے کتنے طفل مکتب کی رہنمائی کرنے کے لیے صحت و عافیت بخشیں، آمین۔

میں اپنے شعبے کے تمام اساتذہ کا بھی ممنون ہوں، جنھوں نے میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی بالخصوص صدر شعبہ پروفیسر سید فضل اللہ مکرم صاحب، ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ اور ڈاکٹر محمد زاہد الحق صاحب کا جن سے میں نے تحقیق کے طریقۂ کار سے لے کر مقالے کی تکمیل و تسوید تک حسبِ ضرورت استفادہ کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنی بیحد مصروفیات کے باوجود مواد کی فراہمی میں بھرپور تعاون کیا اور حسبِ موقع و برمحل میری مدد و رہنمائی فرمائی۔

میں اپنے شعبے کے سینئیر ریسرچ اسکالرز اور ہم جماعت ساتھیوں کا بے حد شکر گزار ہوں بالخصوص ڈاکٹر محمد معین الدین بھائی، کفیل احمد بھائی، محمد نسیم بھائی، ڈاکٹر جابر حمزہ صاحب اور ڈاکٹر نہال افروز صاحب کا جنھوں نے مخلص دوست اور بڑے بھائی کی حیثیت سے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور اپنی مشغولیت کے باوجود میری دستگیری کی۔ تحقیقی و دیگر مشکل مراحل میں مفید مشوروں اور حوصلہ بخش کلمات سے نوازا اور حیدرآباد میں قیام کے دوران میری خبر گیری کو اپنا فریضہ سمجھا۔ ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

میں اپنے والدین اور عزیز رشتہ داروں کی بے غرض محبتوں اور شفقتوں کا بیحد ممنون ہوں، جن کی دعاؤں کا سایہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ یہ ان کی دعاؤں کا ہی اثر ہے کہ میں ہمیشہ زندگی کے سرد و گرم سے محفوظ رہا اور میری طرف آنے والی ہر پریشانیوں نے اپنا رخ دوسری جانب موڑ لیا۔ میں خدا سے دعا گو ہوں کہ والدین کا وجود میرے لیے سراپا

رحمت اوران کی ذات میرے لیے متاع حیات رہے۔ان کی محبت اور مسلسل دعاؤں سے ہی یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اپنے سبھی بھائیوں اور بہنوں کا بیحد ممنون ہوں کہ ان لوگوں نے ہر قدم پر نہ صرف میرا ساتھ دیا بلکہ خود تکلیف و پریشانی اٹھا کر مجھے گھر کی تمام ذمہ داریوں سے آزاد رکھا۔اگر مجھے ان لوگوں نے یہ موقع عنایت نہ فرمایا ہوتا تو شاید میرے لیے اعلیٰ تعلیم کا حصول ناممکن ہوتا۔انھوں نے میری خوشیوں اور ضرورتوں کو مقدم جانا، ہمیشہ میری ہمت بن کر میرے ساتھ کھڑے رہے اور آگے بڑھنے کی تلقین کرتے رہے۔میں ان سب کے روشن مستقبل اور صحت وسلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔

آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ میری ایک طالب علمانہ کاوش ہے اس لیے ممکن ہے کہ اس میں بہت خامیاں اورکمیاں بھی درآئی ہوں جو آپ کے مطالعے اور اصلاح کی منتظر ہیں۔اس مقالے میں جو خوبیاں ہیں وہ میرے نگراں کا فیض اوران کی رہنمائی کا صلہ ہیں اور جو بھی نقائص ہیں وہ میری کم علمی اور کم کج فہمی کا نتیجہ ہیں۔شکریہ

محمد شمیم

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی

بابِ اوّل

علی احمد فاطمی: حیات، شخصیت اور کارنامے

علی احمد فاطمی: حیات، شخصیت اور کارنامے

علی احمد فاطمی ایک اعلیٰ علمی و دینی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے آباء واجداد کا تعلق شہر الہ آباد کے ایک گاؤں لال گنج سے تھا۔ علی احمد فاطمی کے آباء واجداد اپنے گاؤں کے زمیندار اور عزت و مرتبہ والے تھے ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ علمیت اور مذہبی رواداری کے بھی پاسدار تھے۔ ان کے والد ماجد علی شیر فاطمی جید عالم اور اردو، عربی و فارسی سے واقف اور عمدہ مقرر بھی تھے۔ جس کا بیّن ثبوت ان کے آبائی گاؤں میں مدرسہ غریب نواز کا قیام تھا۔ علی شیر فاطمی علمِ حکمت اور شاعری کا بھی شوق و شغف رکھتے تھے۔ علی احمد فاطمی اپنی تصنیف ''سید احتشام حسین: ذکر و فکر'' میں اپنے والد سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''میرے والد عربی، فارسی زبان و ادب کے ماہر تھے اور مذہبیات پر گہری نظر رکھتے تھے، غیر معمولی عاشقِ رسول تھے اور اتنا ہی عشق حضرت علی سے بھی کرتے تھے۔ ان کا نام بھی علی شیر فاطمی تھا۔ انھوں نے اپنے لڑکوں کے نام بھی علی سے رکھے (علی حسن فاطمی، علی اصغر فاطمی، علی احمد فاطمی)۔ شہر الہ آباد کے گاؤں لال گنج نزد جھونسی کے چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ مزاج کے بہت کھرے اور اُصول پسند۔ حق گو اور حق پسند۔ زمین جائداد کے معاملات میں بڑے بھائی یعنی میرے بڑے باپ سے کچھ ان بن ہوگئی۔ زمینداری چھوڑی، گھر بار چھوڑا اور الہ آباد آ گئے۔ خود الہ آباد کے محلّہ دائرہ شاہ اجمل میں ایک کمرے میں رہے اور والدہ اور ہم تین بھائیوں کو نانی اور خالہ کے پاس قصبہ صفی پور ضلع اناؤ بھیج دیا۔'' (۱)

علی احمد فاطمی کی والدہ عابدہ خاتون جونپور کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھنے والی صوم وصلاۃ کی پابند نیک سیرت خاتون تھیں۔ وہ بہت پڑھی لکھی تو نہ تھیں لیکن عربی و فارسی کا علم ضرور تھا۔ البتہ شاعری اور ناول پڑھنے کا غیر معمولی

شوق رکھتی تھیں۔جس کی وجہ سے علی احمد فاطمی کی تربیت بھی علمی،ادبی اور صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔علی احمد فاطمی اپنی تصنیف ''سید احتشام حسین: ذکروفکر'' میں اپنی والدہ سے متعلق رقم طراز ہیں:

''میری والدہ (عابدہ خاتون) جو جونپور کے ایک معزّز خاندان سے تھیں۔ان کے پاس اسکول،کالج کی تعلیم تو نہ تھی لیکن اردو،عربی اور فارسی خوب جانتی تھیں۔شاعری پڑھنے بلکہ کرنے اور ناول پڑھنے کا غیر معمولی شوق تھا۔یہ شوق میری اکلوتی خالہ (ساجدہ خاتون) میں بھی تھا۔دونوں بہنیں اکٹھا ہوتیں تو حمد ونعت کے سلسلے شروع ہوتے اور شادی بیاہ کے گیتوں پر ختم ہوتے۔خالہ کی تو آواز بھی بہت اچھی تھی۔ان سب کا میں نے غیر معمولی اثر قبول کیا۔'' (۲)

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد عالم وفاضل تھے اور والدہ مذہبیات کے ساتھ ساتھ ادب وشاعری میں بھی دلچسپی رکھتی تھیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا ذمہ بھی مدارس کے سپرد کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹی بھیجا۔

ولادت:

علی شیر فاطمی اور عابدہ خاتون کی کل پانچ اولادیں ہوئیں،جس میں تین لڑکے علی حسن فاطمی،علی اصغر فاطمی اور علی احمد فاطمی کے علاوہ دو لڑکیاں رضیہ خاتون اور نوشابہ خاتون ہیں۔علی احمد فاطمی اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔علی احمد فاطمی یکم رجنوری ۱۹۵۴ء کو موضع لال گنج ضلع الہ آباد،اتر پردیش کے ایک سادات گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے دونوں بڑے بھائی پبلک سروس کمیشن (پی،سی،ایس) میں منتخب ہوئے جبکہ علی احمد فاطمی نے ادب کی دنیا میں اپنی علمی وادبی صلاحیت سے ایسا مقام حاصل کیا کہ آج اردو دنیا اسے فراموش نہیں کرسکتی۔

بچپن اور تعلیم وتربیت:

علی احمد فاطمی کی تربیت علمی،ادبی اور صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ابتدائی تعلیم ان کے گھر پر ہی والد (علی شیر فاطمی)،والدہ (عابدہ خاتون)،خالہ (ساجدہ خاتون) اور نانی کی نگرانی میں ہوئی جو اردو،فارسی اور عربی سے گہرا شغف رکھتے تھے۔علی احمد فاطمی کے والد اپنا آبائی گاؤں چھوڑ کر الہ آباد آگئے،اور محلّہ دائرہ شاہ اجمل میں ایک کمرے میں رہنے

لگے۔اس وقت مالی دقتوں کا دورتھا۔ان کی عمر تقریباً ڈیڑھ دوسال رہی ہوگی تبھی ان کے والد نے بیوی بچوں کو ان کی خالہ اور نانی کے پاس قصبہ صفی پور ضلع ،انّاؤ بھیج دیا۔ان کا ننیہال شیعہ مسلک کا تھا چنانچہ علی احمد فاطمی کی پرورش و پرداخت بھی شیعہ مسلک کے تحت ہوئی۔انہوں نے صفی پور میں تقریباً چارسال گزارے اور وہیں پر ہی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور معمولی اردو،عربی بھی سیکھی۔علی احمد فاطمی اپنے بچپن اور صفی پور میں گزری یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اپنی تصنیف ''سید احتشام حسین: ذکروفکر'' میں لکھتے ہیں:

> ''صفی پور جیسے اردو کے تہذیبی علاقہ اور نانی، خالہ، ماموں کے شفقت بھرے احاطے میں جو دن گذرے وہ اس قدر کم عمری کے تھے کہ آج بس وہاں کی چند دُھندلی سی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ نانی کی خاموشی اور اُسی خاموشی میں بولتا ہوا پاندان۔خالہ کا گھیر دار غرارہ اور ان کے دم سے چمکتا ہوا خاندان۔ ماموں کے مرثیوں کا سوز، صفی پور کی درگاہیں، گاگریں اور اڈّے کی بسیں جنھیں ان دنوں لاری کہا جاتا تھا۔انھیں بسوں پر بیٹھ کر ہم بانگرمئو بلگرام بھی گئے اور موہان بھی گئے، جہاں ہم نے دوپہر کی دھوپ میں حسرت موہانی کا مکان دیکھا۔'' (۳)

جب حالات کچھ موافق ہوئے تو علی شیر فاطمی نے شہرالہ آباد میں ایک کرایے کا مکان لے کر اپنے اہل خاندان کو بلالیا اور رانی منڈی میں واقع اسکول ''یادگارِ حسینی'' میں دوسرے یا تیسرے درجے میں داخل کرادیا۔ جہاں پر علی احمد فاطمی نے دوسال تک مولوی شبیر صاحب اور حسنین صاحب کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔

علی احمد فاطمی کے والد نے تقریباً دوسال کرائے کے مکان میں گزارنے کے بعد سلطان پور بھاوا نئی بستی میں ایک چھوٹا سا مکان خریدا۔اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔گھر منتقل ہوا تو تعلیم گاہ بھی بدل گئی۔اب علی احمد فاطمی کا داخلہ ''مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج'' کے چوتھے درجے میں کرایا گیا۔ جہاں پر انھوں نے ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔

علی احمد فاطمی کو زمانۂ طالب علمی سے ہی ناولوں کے مطالعے کا گہرا شوق وشغف ہوا جس کی وجہ دو ہیں،اول ایک ہم جماعت دوست جسے ناولوں سے بہت رغبت تھی،دوم ان کی والدہ کو بھی تاریخی ناولوں کے مطالعے کا بہت شوق تھا،جن کے لیے وہ قریب کی واقع لائبریری سے پندرہ روز کے وعدے پر دو دو ناول لایا کرتے تھے۔والدہ کے ساتھ وہ بھی ان ناولوں کا مطالعہ کرلیا کرتے تھے۔

علی احمد فاطمی نے آٹھویں جماعت سے بارہویں جماعت تک کی تعلیم سی۔اے۔وی انٹر کالج میں مکمل کی۔ جہاں ان کے اردو کے استاد سید شفیق احمد تھے۔وہ اکثر ''بزم ادب'' کے نام سے پروگرام کرواتے رہتے تھے۔اس بزم میں تحریری وتقریری مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔شعبۂ اردو کی جانب سے یہاں پر مشاعرے اور ڈرامے کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔علی احمد فاطمی نے پہلی باریہیں پر ڈرامے میں حصہ لیا اور مشاعرے کے اہتمام میں پیش پیش رہے۔اور وہ ساتویں، آٹھویں جماعت سے ہی مضمون نویسی، بیت بازی اور ڈرامہ نگاری میں شرکت کرتے تھے۔

علی احمد فاطمی نے ۱۹۶۸ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۷۰ء میں انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں بی۔اے میں داخلہ لیا۔انہوں نے اپنے مضامین کے طور پر اردو، فارسی اور تاریخ منتخب کیا۔الہ آباد یونیورسٹی کے اساتذہ جن میں فارسی کے پروفیسر رفیق حسین، اردو میں مشہور ترقی پسند ناقد سید محمد عقیل رضوی اور تاریخ میں ریکھا جوشی تھیں، جن کی سرپرستی میں علی احمد فاطمی نے ۱۹۷۲ء میں بی اے کی تعلیم مکمل کیا۔تب بی اے صرف دو سال کا ہوتا تھا۔

علی احمد فاطمی نے اپنے بڑے بھائیوں کے ایما پر الہ آباد یونیورسٹی میں ہی ایم۔اے تاریخ میں داخلہ لے لیا۔ کیوں کہ ان کے والد اور بڑے بھائیوں کی خواہش تھی کہ وہ بھی مقابلہ جاتی امتحان میں بیٹھیں، جن میں ان کے دونوں بڑے بھائی پہلے ہی کامیاب ہوکر برسرِ روزگار ہوچکے تھے۔ان کا داخلہ تاریخ میں تھا لیکن ان کا ذہنی رجحان ہمیشہ سے ہی اردو ادب کی طرف مائل تھا۔لہٰذا انھوں نے سید احتشام حسین کی مدد سے اپنا داخلہ تاریخ سے اردو میں منتقل کرالیا۔علی احمد فاطمی احتشام حسین سے بہت متاثر تھے۔ان کی پدرانہ شفقت اور اردو دوستی کا ذکر ''سید احتشام حسین: ذکر و فکر'' میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> ''ایک شام میں اپنے گھر کے پاس ایک سبزی کی دکان پر کھڑا سبزی خرید رہا تھا کہ اچانک میری پیٹھ پر ایک نرم ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ پلٹ کر دیکھا تو احتشام حسین تھے۔میں چونک گیا، بلکہ گھبرا گیا۔
>
> ''ارے سر آپ!''
>
> ''بھئی میں عبّاس حسینی (مالک جاسوسی دنیا) کی طرف جا رہا تھا کہ تم دکھائی دے گئے۔کیا تم یہیں رہتے ہو؟''
>
> ''جی جی۔اسی ڈھال کے نیچے!''

''چلو اپنا گھر دکھاؤ۔'' احتشام صاحب نے نہایت اپنائیت سے کہا۔ میں گھبرا گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ لیکن ایک عمدہ استاد کا مقصد تو کچھ اور ہی تھا۔ میں نے گھر دکھایا جو بالکل قریب تھا۔ وہ میرے غریب خانہ کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

''میرے ساتھ عبّاس حسینی کے گھر تک چل سکتے ہو؟''

''ضرور ضرور!''

میں خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ میرے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ عبّاس حسینی کا نیا گھر قریب ہی تھا جس کا فاصلہ آٹھ دس منٹ میں طے ہو گیا۔ لیکن اس مختصر سے وقفہ نے، اتنی چھوٹی سی مدّت نے میرے کیریئر کا رُخ بدل دیا۔ زندگی کے راستے بدل گئے۔ سب کچھ بدل گیا۔ انھوں نے کہا کہ تمہاری تقریر اچھی تھی، تم فسٹ آئے۔ اس کی مجھے خوشی ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اردو میں داخلہ لو۔ اور جب میں نے بتایا کہ میں تو تاریخ میں داخلہ لے چکا ہوں تو انہوں نے کہا کہ میں تبادلہ کروا دوں گا بس تم اپنے والدین سے اجازت لے لو۔ اور یہ جملہ تو میرا مقدّر ہی بن گیا۔''

''تم جیسے طالب علموں کو تو اردو میں آنا چاہیئے۔'' (۴)

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

''مجھے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ میں بی اے فائنل میں تھا۔ شعبۂ اردو میں ایک تقریری مقابلہ ہوا۔ دوسری یونیورسٹی کے طلباء بھی شریک ہوئے۔ احتشام حسین اس کے خصوصی مہمان تھے۔ موضوع تھا ''مذہب کے بغیر تہذیب کھوکھلی ہوتی ہے۔'' اس تقریری مقابلے میں میں اوّل آیا۔ احتشام حسین کے ہاتھوں انعام و اعزاز ملا جو میرے لئے یادگاری لمحہ تھا۔'' (۵)

علی احمد فاطمی اس کے بعد ہی تاریخ سے ایم اے اردو میں منتقل ہو گئے۔ اور یہاں ان کے اساتذہ پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر مسیح الزماں اور سید محمد عقیل رضوی تھے۔ علی احمد فاطمی رفتہ رفتہ شعبہ میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے سید احتشام حسین کے قریب ہو گئے۔ لیکن ان کا ساتھ صرف پانچ مہینے تک ہی میسر رہا کیونکہ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر مسیح الزماں اور سید محمد عقیل رضوی نے علی احمد فاطمی کی مدد اور رہنمائی کی۔ علی احمد فاطمی کو ۱۹۷۴ء

میں ایم اے کرنے کے بعد ریسرچ کا خیال آیا۔اور انہوں نے اپنے تحقیق کا موضوع ''عبدالحلیم شرر بحثیت ناول نگار'' منتخب کر کے مسیح الزماں کی نگرانی میں داخلہ لے لیا،لیکن جلد ہی ان کا بھی فروری ۱۹۷۵ء میں انتقال ہو گیا۔اب علی احمد فاطمی کی عجیب کیفیت ہوئی اور وہ بہت پریشان بھی ہوئے۔اس کے بعد ہی خلیل الرحمان اعظمی جوان کے ماموں کے دوست تھے،انہوں نے علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔اور وہ ان کی دعوت پر علی گڑھ جانے کو تیار بھی ہو گئے۔علی گڑھ جانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ ایک شام سید محمد عقیل رضوی نے ان کو اپنے گھر بلایا اوران سے پوچھا اور اپنی نگرانی میں لینے کا وعدہ کر لیا۔اس طرح علی احمد فاطمی ابتدا سے ۱۹۷۹ء میں مقالہ داخل کرنے تک الہ آباد میں ہی رہے۔اور یہیں پر اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔علی احمد فاطمی اسی درمیان انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے اور اپنی بہترین کارکردگی اور متحرک فطرت کی بدولت الہ آباد شاخ کے سکریٹری مقرر کیے گئے۔وہ شروع سے ہی بیت بازی،مذاکرے اور مقالہ نگاری میں حصہ لیتے رہتے تھے۔اس کے بعد''اندازے'' نام کا رسالہ بھی نکالا،جس میں صرف نئی کتابوں پر تبصرہ ہوتا تھا اگر کوئی مضمون چھپتا بھی تھا تو وہ صرف سید محمد عقیل رضوی لکھتے تھے۔علی احمد فاطمی جلسے اور جلوس کی رپورٹنگ بھی کرتے تھے،اور یہی آگے بڑھ کر''رپورتاژ'' کی شکل اختیار کر لی۔انہوں نے افسانے بھی لکھے۔

ادبی پس منظر:

علی احمد فاطمی کے گھر کا ماحول مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی بھی تھا۔ان کے والد عالم و فاضل تھے،اوران کی والدہ اور خالہ بھی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی والدہ اور خالہ کا اثر زیادہ قبول کیا،جس کی وجہ سے وہ ادب کی طرف مائل ہوئے۔علی احمد فاطمی اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ''گھر میں علمی و مذہبی ماحول تھا،والدہ خالہ اور بڑی بہنیں عبدالحلیم شررؔ،راشدالخیری اور صادق سردھنوی وغیرہ کے ناول بڑے شوق سے پڑھتی تھیں۔'' (۶)

آگے پھر علی احمد فاطمی اپنے مضمون''پالا ہوا ہے وہ نسیم بہار کا''میں اپنے مذہبی ماحول کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''مجھے تو (علی احمد فاطمی) ابن صفی کے ناول بہت پسند آتے کہ ان کے قصے،ان کے کردار،ان کی زبان ان دنوں مجھے دیوانہ کیے ہوئے تھی، میں یہ ناول چوری چھپے پڑھتا کہ گھر کا ماحول کھلے عام پڑھنے کا اجازت نہیں دیتا تھا۔والد صاحب گھر میں

تاریخ طبری پڑھتے تھے اور باہر میلاد شریف اور مجھے بھی ٹوپی پہنا کر نعت شریف پڑھواتے۔ والدہ اور بڑی بہنیں دن میں لہک لہک کر سبز گنبد پر سلام بھیجتیں اور رات کو پوری عقیدت کے ساتھ اجتماعی طور پر شرؔر کے ناول پڑھے جاتے۔'' (۷)

علی احمد فاطمی آگے پھر اپنے مذہبی ماحول کے بارے میں اپنے ہی مضمون ''فضل امام یعنی کر پا رام'' میں لکھتے ہیں:

''میرا خاندان بھی بیحد مذہبی ہے اور آدھا شیعہ بھی میرا بچپن (صفی پور، اناؤ) میں گذرا جہاں شیعہ حضرات زیادہ ہیں۔ مجلس محرم کے سایے میں گذرا ہے۔ اس لیے میرے لیے زیادہ زحمت نہ تھی البتہ میری بیوی کے لیے ضرور زحمت تھی اور پابندی بھی لیکن وہ بیحد شریف، مہذب اور مہمان نواز خاتون ہیں اس لیے وہ یہ سارے کام خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔'' (۸)

علی احمد فاطمی کچھ دنوں بعد ڈرامہ بھی ایکٹ کرنے لگے اور ''علی بابو'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی زندگی جس طرح آگے بڑھتی گئی، ان کے اساتذہ بھی اچھی رہبری کرتے رہے۔ اور اعلیٰ تعلیم تک آتے آتے انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کا رشتہ جڑ گیا۔ سید احتشام حسین، سید محمد عقیل رضوی، قمر رئیس، علی سردار جعفری، فراق گورکھپوری اور کیفی اعظمی وغیرہ سے ترقی پسندی کا سبق سیکھا۔ اور بہت جلد ہی ترقی پسندوں کی صف کے ایک عمدہ سپہ سالار بن کر ادبی دنیا میں اپنا مقام متعین کر لیے۔

علی احمد فاطمی کے اندر روایت سے بغاوت کی جو چنگاری تھی وہ ترقی پسندوں کے ذریعے اور تیز ہو گئی۔ ان کو اساتذہ بھی بہت فعال اور لکھنے پڑھنے والے ملے جن کا پورا اثر ان کی زندگی پر پڑا اور وہ بھی مجلسوں، سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کر کے بہت فعال اور مشہور و مقبول ہو گئے۔ اور اب تو علی احمد فاطمی ادبی دنیا میں ''سمیناری آدمی'' کے نام سے بھی پکارے جانے لگے۔

علی احمد فاطمی جتنے اچھے ادیب و نقاد ہیں اتنے ہی عمدہ مقرر بھی۔ ان کی تقریروں اور تحریروں کی لفظیات یکساں انداز رکھتی ہے۔ اور وہ اپنی تحریر کو بھی تقریری انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جس طرح ان کے اساتذہ ترقی اور نظریے کی بات کرتے تھے، علی احمد فاطمی بھی اسی طرح نظریات اور پیغامات کی بات ہر جگہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب ایسا اس لیے

ہوا کہ ان کی پوری زندگی انہی سب باتوں کے درمیان گزری ہے۔

ان سب کے علاوہ علی احمد فاطمی کی زندگی کا خاص جز اخلاقیات بھی ہے، جس کا درس اپنے ابتدائی دور میں والد سے اور بعد میں اساتذہ سے لیتے رہے۔ اور ان کا رنگ ان کی تحریروں، افسانوں، خاکوں، سفرناموں اور رپورتاژ وغیرہ میں جابجا نظر آتا ہے۔ کل ملا کر علی احمد فاطمی ادب میں ایک اچھے اور بلیغ انسان ہیں، اور ان کی زندگی کا مقصد ہی ادب کی ترقی کرنا ہے۔

ملازمت:

علی احمد فاطمی نے ۱۹۷۹ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے اپنا ڈی فل کا تحقیقی مقالہ مکمل کیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں سینٹ جانس کالج، آگرہ میں بحیثیت اردو لیکچرر مقرر ہوئے۔ ممتحن کی حیثیت سے شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد نسیم قریشی تھے۔ انٹرویو دینے والوں میں علی احمد فاطمی تنہا امیدوار تھے جن کے پاس ڈی فل کی ڈگری تھی۔ اس لیے علی احمد فاطمی کا وہاں انتخاب ہو گیا۔ علی احمد فاطمی برسرِ روزگار تو ہو گئے مگر ان کا ذہن آگرہ اور سینٹ جانس کالج سے بے زار ہی رہتا تھا۔ اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ''آگرہ میں سیمینار مشاعرے کیے ایک سچ یہ ہے کہ میرا دل آگرہ میں نہ لگتا۔ علی گڑھ قریب ہے ہر ہفتہ وہاں چلا جاتا اور احباب میں دو تین دن گذار کر واپس آگرہ آجاتا۔ میرا بھی جی چاہنے لگا کہ میں بھی یونیورسٹی میں پہنچوں علی گڑھ یا الہ آباد۔''
>
> (۹)

علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ آگرہ کی ملازمت بڑی مشکل تھی، کیونکہ وہاں طلباء نہیں تھے اور ''وی۔سی'' نے کہا تھا کہ پچاس فیصد بچے ہوں گے تبھی تنخواہ بنے گی۔ بڑی مشقتوں سے طلباء جمع کیے اور شعبہ شروع ہو گیا۔ سینٹ جانس کالج، آگرہ میں تین سال ملازمت کے بعد جون ۱۹۸۳ء میں علی احمد فاطمی کا تقرر بطور لیکچرر الہ آباد یونیورسٹی میں ہو گیا۔ علی احمد فاطمی نے ادب کے میدان میں مسلسل محنت اور عمدہ کارکردگی کی بنا پر ان کی ترقی کر دی گئی۔ اور پھر علی احمد فاطمی ۱۹۹۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں ہی اسوشیٹ پروفیسر ہوئے۔ اور پھر ۲۰۰۳ء میں علی احمد فاطمی الہ آباد یونیورسٹی میں ہی پروفیسر ہوئے۔ علی احمد فاطمی پہلی مرتبہ ۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۰ء تک اور دوسری مرتبہ ۲۰۱۴ء تا ۲۰۱۶ء تک اور تیسری مرتبہ ۲۰۱۹ء

میں الہ آباد یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے فرایض انجام دیتے رہے۔

شادی:

علی احمد فاطمی کی شادی ۱۹۸۰ء میں الہ آباد کے ہی محلّہ دریاباد میں ''رعنا'' سے ہوئی ہے۔ رعنا ایک پڑھی لکھی اور مہذّب خاتون ہیں۔ وہ شعروشاعری اور وعظ ومیلاد وغیرہ میں بھی شغف رکھتی ہیں۔ مشرقی طرزِ معاشرت کی گھریلو خاتون ہیں اور ان کی شخصیت بہترین اخلاق کی حامل ہے۔ رعنا اپنے شوہر علی احمد فاطمی کا حد درجہ خیال رکھتی ہیں۔ علی احمد فاطمی اس تعلق سے اپنے مضمون ''فضل امام یعنی کرپارام'' میں لکھتے ہیں:

> ''میرا بچپن ننیہال (صفی پور۔اناؤ) میں گزرا جہاں شیعہ حضرات زیادہ ہیں۔ مجلس محرم کے سائے میں گزرا ہے اس لیے میرے لیے زیادہ زحمت نہ تھی البتہ میری بیوی کے لیے ضرور زحمت تھی اور پابندی بھی لیکن بیحد شریف، مہذب اور مہمان نواز خاتون ہیں اس لیے وہ یہ سارے کام خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔'' (۱۰)

اس اقتباس کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علی احمد فاطمی کی ازدواجی زندگی بہت خوبصورت رہی ہے۔ دونوں میں بے انتہا پیار ومحبت ہے۔ رعنا فاطمی کی طبیعت کچھ علیل بھی رہتی ہے لیکن علی احمد فاطمی اپنی تمام مشغولیات کے باوجود ان کا بیحد خیال رکھتے ہیں۔ اسی لیے علی احمد فاطمی اور رعنا فاطمی اپنی ازدواجی زندگی میں بہت خوش ہیں۔

اولاد:

علی احمد فاطمی کی دو صاحبزادیاں ہیں۔ نائلہ فاطمی اور انجیلا فاطمی۔ دونوں لڑکیوں کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد والدین نے ان کی شادی اچھے گھرانے میں انجام دے کر اپنا فریضہ انجام دیا ہے۔

شخصیت:

شخصیت کسی بھی انسان کی داخلی اور خارجی خصوصیات کے مجموعے کا نام ہے۔ کسی بھی انسان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کی سیرت وشخصیت کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنی پڑتی ہے۔ جن میں حلیہ، عادات واطوار، سیرت وکردار خصوصی طور پر شامل ہیں۔ شخصیت اگر ادبی نوعیت کی ہو تو اس کی ادبی کاوشوں، تحریروں اور تقریروں سے بھی اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر علی احمد فاطمی کی شخصیت کو دیکھیں تو ہمیں ان کی شخصیت بہت

دلچسپ، پرکشش اور متاثر کن معلوم ہوتی ہے۔علی احمد فاطمی بہت ہی سیدھے سادے، سچے، خوش دل اور دلفریب انسان ہیں۔علی احمد فاطمی کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر غضنفر علی اپنے تخلیق کردہ خاکے ''موبائل آدمی'' میں رقم طراز ہیں:

''پڑھنا، پڑھانا، لکھنا، لکھوانا، لکھوا کر پڑھوانا، محفلیں سجانا، سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے آج دلی تو کل ممبئی اور پرسوں اودے پور میں ہونا، ایک ادبی رسالہ نکالنا، اپنے نظریاتی مسلک کا الم اٹھانا، اسے جھکنے سے بچانا، مختلف سمتوں میں مختلف محاذوں پر بادِ مخالف سے جوجھنا، کبھی معرکہ سر کرنا، کبھی پسپائی کا منہ دیکھنا، گرد جھاڑ کر پھر سے مقابلے پر ڈٹ جانا، بیمار بیوی کو دل وجان سے تیمارداری کرنا، اپنے پرائے کا خیال رکھنا، دلوں میں بسنا، سینے میں دلوں کو بسانا، انھیں ٹوٹنے سے بچانا، اِدھر اُدھر سے طعن وتشنیع سننا اور سہنا کوئی آسان کام نہیں مگر یہ سارے کام ایک آدمی بڑی آسانی، خوش اسلوبی، مستعدی، دل جمعی اور جواں مردی سے کرتا ہے۔'' (۱۱)

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

''ایک پیارا دوست
ایک فراخ دل آدمی
ایک خوش بیان مقرر
ایک زوٗ دنویس نثر نگار
ایک اچھا استاد
ایک لائق شاگرد
ایک بھروسہ مند انسان
ایک ماہر منتظم
ایک وفادار (Committed) ترقی پسند ادیب'' (۱۲)

اس اقتباس کے بین السطور معنویت سے ہمیں علی احمد فاطمی کی شخصیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔علی احمد فاطمی کی شخصیت میں سنجیدگی، متانت اور مزاج میں نرمی ورواداری بدرجہ اتم موجود ہے۔اتنی مصروفیت اور ذمہ داریوں کے باوجود انھوں نے اپنی شخصیت کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ان کی انھیں خصوصیات کو عبدالصمد کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''فاطمی دوستوں کے دوست ہیں۔ برسہا برس کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ تو آتے ہی ہیں۔فاطمی کو جذباتیت کا شوق بھی ہے جس سے انہیں اکثر نقصان بھی ہوا ہے۔وہ بدگمانی کے شکار بھی ہوئے اور کچھ دوستوں نے انہیں بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں تک کہ کچھ نے تو ان سے تعلقات بھی منقطع کر لئے۔مگر فاطمی نے کوشش کی کہ ان کی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے دوستی کی حرمت پر حرف آئے۔دوستی کی ڈور کمزور ضرور ہوئی لیکن ہاتھوں سے چھوٹی نہیں۔وہ کوئی نہ کوئی راستہ،کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر کے اسے مضبوطی سے پکڑے رہے۔ان میں رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔شاید یہ ان کے خاندانی خون اور گھریلو ترتیب کا ثمرہ ہے۔ان کے ساتھ ہزار کوئی تلخ کلامی سے پیش آئے،وہ اس کا جواب اس سطح پر آکر نہیں دے سکتے۔وہ بے حد غصہ کے عالم میں متانت کا دامن نہیں چھوڑتے۔ان کے خلاف بے بنیاد باتیں پھیلا کر انہیں ذہنی کوفت پہنچائی گئی۔وہ چاہتے تو ان کا مدلل جواب دے سکتے تھے یا کم سے کم اپنے کسی شاگرد،کسی دوست،کسی شنا سا سے دلوا دیتے،پر انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ کچھ مخلصوں کو ایسا کرنے سے منع بھی کیا۔ان کا کہنا ہے کہ کل وہ دوست تھا،آج دشمن بن گیا،کل کو پھر دوست بن سکتا ہے اور واقعی کئی بار ایسا ہوا بھی۔فاطمی اپنے دل کا ایک دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتے ہیں۔'' (۱۳)

حلیہ:

علی احمد فاطمی کا حلیہ کچھ اس طرح ہے: درمیانی قد،گیہواں رنگ،مناسب جسامت،کتابی چہرہ،سر کے اوپری حصے کے بال ندارد،کلین شیو،ڈریسنگ سینس بہت عمدہ،آنکھوں پر چشمہ اور چشمہ ناک کے ابتدائی حصے پر آکر رکا ہوا اور چہرے پر سنجیدگی کی وجہ سے ان کی شخصیت بہت ہی متاثر کن معلوم ہوتی ہے۔علی احمد فاطمی کا ملنے کا سلیقہ نہایت ہی پُر تپاک ہے۔کوئی بھی نیا شخص ان سے ملنے والا یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ پہلی بار مل رہا ہے۔علی احمد فاطمی کی شخصیت کی عکاسی غضنفر علی نے کی ہے،جو زمانۂ طالب علمی سے ہی ان کے دوست بھی رہے ہیں۔غضنفر علی اپنے لکھے ہوئے خاکے ''موبائل آدمی''میں علی احمد فاطمی کی حلیہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دبلا پتلا جسم،اوسط قد،گیہواں رنگ،پکی عمر مگر کچّا لُک،جیسے کوئی جواں سال مرد۔

پیشانی سے لے کر آدھے سر تک پورا چاند، یہ چاند اس چرخ پر چمک رہا ہے جس کے مطلع پر کبھی ایک ایسا مشرقی ماہتاب طلوع ہوا تھا جس نے مغربی آفتاب کے تابناک چہرے کو اپنے اکبری طنزیہ تیروں سے نہ صرف یہ کہ داغدار کیا بلکہ اسے غروب ہونے پر مجبور بھی کر دیا۔''   (۱۴)

لباس :

علی احمد فاطمی ترقی پسند سوچ وفکر کے حامل ہیں۔اسی لیے وقت اور ماحول کے ساتھ خود کو ڈھالنا جانتے ہیں اور اسی مناسبت سے وہ لباس بھی زیبِ تن کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی کی فکر میں تو کلاسکیت بھری پڑی ہے،لیکن ظاہری طور پر وہ رنگین مزاج اور ترقی پسند انسان ہیں۔اسی لیے وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں جدید طرز کے ملبوسات زیبِ تن کرتے ہیں۔یونیورسٹی میں فارمل لباس یعنی چھوٹے چیک کا شرٹ اور پتلون پہنتے ہیں اور سردی کے موسم میں کوٹ ٹائی اور گلے میں اسکارف بھی ڈالتے ہیں۔وہ گھر یا سفر میں کُرتا پہننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی کے لباس کے بارے میں غضنفر علی اپنے تخلیق کردہ خاکے ''موبائل آدمی'' میں لکھتے ہیں۔

''فاطمی کو صرف محفلیں سجانے کا ہی سلیقہ نہیں ہے بلکہ خود کو سنوارنے اور سجانے کا بھی سلیقہ آتا ہے۔ان کا ذوقِ جمال کافی نکھرا اور ستھرا ہوا ہے۔وہ اچھا لباس پسند کرتے ہیں۔اچھے رنگ کا انتخاب کرتے ہیں۔اچھے ڈیزائن کو فوقیت دیتے ہیں۔نئے سے نئے فیشن کو اپناتے ہیں مگر نئے پن کے راستے میں پھوہڑ پن نہ آنے پائے اس کا پورا خیال رکھتے ہیں۔''   (۱۵)

مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھیں تو ہمیں علی احمد فاطمی کے لباس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔علی احمد فاطمی کے پہننے اور اوڑھنے کے شوق کا یہ عالم ہے کہ ان کے گھر میں کپڑوں کی الماریاں ایسی لگتی ہیں جیسے کسی بازار کی دوکان میں رکھے ہوئے شوکیس ہوں۔اس طرح علی احمد فاطمی وقت اور موقع ومحل کے حساب سے اپنے ملبوسات کو زیبِ تن کرتے رہتے ہیں۔

غذا:

علی احمد فاطمی کی غذا یوں تو بہت کم ہے لیکن ان کو اچھی اور نئی طرح کی ڈشز کا بہت شوق ہے۔وہ ہر نئی جگہ کے

مشہور کھانوں کا شوق رکھتے ہیں۔ جیسے حیدر آباد میں خوبانی کا میٹھا یا الہ آباد کی نہاری کی مختلف اقسام کو اپنے پسندیدہ طعام میں شامل کرنے کا شوق ہے۔ دعوت کھانے اور دعوت دینے کا بھی بہت شوق ہے۔ علی احمد فاطمی کے اس فراخ دلانہ مشغلے میں ان کی بیگم رعنا اور ان کے بچّے بھی جی کھول کر ساتھ دیتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر ہاتھ بھی بٹاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''فاطمی کی خوراک بہت کم ہے، اور وہ کھانے کے دوران ادب کی باتیں کرتے رہتے ہیں، اور ان کے ساتھ کھانے میں شرمندگی بھی محسوس ہوتی ہے، کیوں کہ وہ بہت کم کھاتے ہیں، لیکن کھانے میں دلچسپی ہے۔'' (۱۶)

مزاج:

علی احمد فاطمی کا مزاج نہایت مشفقانہ، نرم اور شفقت سے پُر ہے۔ ان سے ملنے والا اگر شاگرد ہو تو لہجہ نہایت مشفقانہ اور اگر دوست ہو تو بے تکلفانہ اور یار باش ہوتا ہے۔ علی احمد فاطمی کے مزاج کے بارے میں نگار عظیم کہتی ہیں:

''دوستوں کے ساتھ ان کا مزاج بے حد مخلصانہ اور محبت بھرا ہوتا ہے۔ ایماندار اور مشکل میں مددگار، شاگردوں پر توجہ دیتے ہیں اور لوگوں کی کمیوں کو چھپاتے ہیں، شرمندہ نہیں کرتے ہیں۔ دشمنی تو اولاً وہ کرتے نہیں اور اگر کوئی کرتا ہے تو اسے بھی بڑی تہذیب سے نبھاتے ہیں۔'' (۱۷)

آگے پھر اسی سلسلے میں پروفیسر ظفر الدین کہتے ہیں:

''وہ دوست کے دوست یہ تو کوئی بھی ہوتا ہے لیکن وہ تو اپنے دشمنوں کے بھی دوست ہوتے ہیں۔'' (۱۸)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں علی احمد فاطمی اعلیٰ اقدار کے امین نظر آتے ہیں، جہاں بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت کرنا لازمی ہوتا ہے۔ علی احمد فاطمی کے اخلاقیات کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس لیے یہ چیزیں ان کی تخلیق میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔

علاوہ ازیں علی احمد فاطمی کے ارباب قلم و دانش کا حلقہ بہت وسیع ہے، جن میں قومی و بین الاقوامی سطح کے ادیب و شاعر و فن کار شامل ہیں۔ ان سے ادبی و علمی حوالے سے گفت و شنید ہوتی رہتی ہے اور آمد و رفت کا سلسلہ بھی برقرار رہتا

ہے۔مشہور ترقی پسند ناقد عارف نقوی جرمنی سے علی احمد فاطمی کے گہرے مراسم ہیں۔ان کے علاوہ باقر نقوی،سید آشور کاظمی، خالد صابر،افتخار عارف،بخش لائل پوری،اشفاق حسین،ساقی فاروقی،احمد فراز،رضا علی عابدی،اقبال حیدر، اشفاق احمد،داداخان نوری اور شہزاد عبداللہ احمد وغیرہ سے بھی گہرے مراسم ہیں۔

ہندوستانی ادیبوں وناقدوں میں متحرک اور فعال لکھنے پڑھنے والوں میں بیشتر سے علی احمد فاطمی کے اچھے روابط ہیں شاید اسی لیے کئی ادیبوں نے ان پر خاکے اور تعارفی مضامین قلم بند کئے ہیں۔علی احمد فاطمی کی دوست نوازی کا ذکر کرتے ہوئے فکشن نگار عبدالصمد اپنے مضمون ''دوستوں کا دوست'' میں رقمطراز ہیں:

> ''فاطمی ایسے دوست ہرگز نہیں ہیں جنہیں کسی بھی حال میں نظر انداز کیا جا سکے،
> دراصل وہ دوستوں کو اس کا موقع بھی نہں دیتے اور دھڑلے سے،جب ان کا جی
> چاہے نظروں کے سامنے یا سوچ کے دروازوں کو وا کرتے ہوئے چلے آتے ہیں۔وہ
> دوستوں کے لئے ایک ناگزیر شخصیت بن گئے ہیں۔'' (۱۹)

ان کے مشہور دوستوں میں صغیر افراہیم،غضنفر علی،عبدالصمد، بیگ احساس،فاروق بخشی،ثروت خان،خواجہ محمد اکرام الدین،انور پاشا،احمد محفوظ،ظفرالدین،آفاق احمد آفاقی اور ابن کنول وغیرہ شامل ہیں۔

معمولات:

علی احمد فاطمی کی معمولاتِ زندگی میں صبح ۵ربجے جاگنا اور ۳رگھنٹے پڑھنا لکھنا ہے۔وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔وقت پر یونیورسٹی پہنچتے ہیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی درسی ذمہ داری کو انجام دیتے ہیں۔چونکہ ادب ان کا شیوہ ہونے کے ساتھ پیشہ بھی ہے۔اس لیے وہ ادب کے ساتھ بھی بہت ایماندار ہیں۔اور پھر وہ رات میں ۹ربجے ۲رگھنٹے لکھتے پڑھتے ہیں۔پڑھنے لکھنے کے دوران ہی وہ اپنے علمی وادبی کارنامے بھی انجام دیتے ہیں۔اور جو باقی کا وقت ہوتا ہے وہ اپنے نجی کاموں میں صرف کرتے ہیں۔یونیورسٹی میں بھی وہ خالی وقتوں میں پڑھنے،لکھنے کا کام کرتے رہتے ہیں۔یونیورسٹی میں ان سے کوئی بھی ملنے والا آتا ہے تو وہ سیدھے دفتر میں ہی ملنے آجاتے ہیں،اور وہ نہایت مشفقانہ انداز میں ان کی رہبری بھی کرتے ہیں۔اور پھر شام کے وقت گھر پر ملنے والوں کے ساتھ وہ اکثر چائے پر ادبی گفتگو بھی کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی ان تمام مشغولیات سے وقت بچا کر سمیناروں،کانفرنسوں،ادبی اور مذہبی محفلوں میں

شریک بھی ہو جایا کرتے ہیں۔اور وہ ادبی و مذہبی محفلوں میں شریک ہونے کے علاوہ بڑھ چڑھ کر ان میں حصہ بھی لیتے ہیں۔علی احمد فاطمی کی یہ عام سی زندگی ہے، جسے وہ اپنے عمل کے ذریعے خاص بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوست واحباب:

علی احمد فاطمی ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں۔دوستوں کے ساتھ ان کا تعلق ایماندارانہ اور خلوص بھرا ہوتا ہے۔وہ دوستی کرنا اور اسے نبھانا اچھے سے جانتے ہیں۔اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ زمانۂ طالب علمی کے ہم جماعت ساتھی جن کی تعداد تقریباً دس تک تھی، آج بھی ان سے تعلقات برقرار ہیں۔اور وہ سبھی دوست ان کے پروگراموں، جلسوں اور ادبی محفلوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی کے رفقا میں احمد حسن، فضل حسنین، ڈاکٹر فخر الکریم، فرمود الہ آبادی، خورشید، خواجہ جاوید اختر، سید محمود زاہد فاخری، اسلم الہ آبادی، نظام صدیقی اور مہدی جعفر وغیرہ ہیں، جن سے آج بھی بہت اچھے تعلقات قائم ہیں۔ان لوگوں کے ساتھ ادبی محفلوں، مجلسوں اور پروگراموں میں بے تکلف شامل ہونا علی احمد فاطمی کی خصوصیات میں سے ہے۔علی احمد فاطمی بہت ہی یار باش، مخلص دوست، ہمدرد اور مددگار بھی ہیں۔اس سلسلے میں غضنفر اپنے لکھے ہوئے خاکے ''موبائل آدمی'' میں لکھتے ہیں:

> ''فاطمی کی شخصیت کے جتنے روپ ابھرتے ہیں ان میں سب سے نمایاں اور ممتاز روپ دوست کا ہے۔فاطمی ایک پیارا اور اچھا دوست ہے، ایسا دوست جسے دوستی کے آداب اور دلداری کے ہنر آتے ہیں، وہ یہ جانتا ہے کہ دل کے آبگینے ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتے ہیں اور آبگینوں کے ٹوٹنے کا درد بڑا جاں گسل ہوتا ہے اس لئے وہ آبگینوں کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ان کو بچانے کے لئے وہ بڑے سے بڑا نقصان بھی اٹھا لیتا ہے۔مخالفت کی مار کو چپ چاپ سہ لیتا ہے۔اپنی تضحیک کے زہر کو بھی خاموشی سے پی جاتا ہے۔وہ دشمن کے ساتھ بھی دوست کی طرح پیش آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے دشمن بھی اس کے ایک اچھے دوست ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔''
>
> (۲۰)

علی احمد فاطمی اپنے دوستوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا پسند کرتے ہیں۔اور دوستوں کے ساتھ رہنا علی احمد فاطمی کا پسندیدہ عمل ہے۔

تلامذۂ علی احمد فاطمی:

علی احمد فاطمی نے تقریباً چار دہائیوں تک تدریس کا اہم فریضہ انجام دیا ہے اور ایک عمدہ استاد کی طرح کثیر شاگردوں کی فہرست تیار کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو درس وتدریس سے وابسطہ ہونے میں ہر ممکن مدد ورہنمائی بھی فرمائی ہے۔ پروفیسر ابن کنول رقمطراز ہیں:

> ''فاطمی خوش شکل اور خوش لباس ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان اور استاد ہیں۔ اپنے شاگردوں کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں، ان کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں، انھیں آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ ہر طرح سے اپنے شاگردوں کی ہر طرح کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جب دہلی کے سمینار میں آتے ہیں اپنے شاگردوں کو اپنے خرچ پر لاتے ہیں، انھیں متعارف کراتے ہیں، ان سے مقالے لکھواتے ہیں۔ فاطمی صرف استاد نہیں ایک مکمل ادارہ ہیں۔ استاد وہ نہیں ہوتا جو صرف کلاس میں پڑھا کر چلا جائے، اصل استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے شاگردوں کی تربیت بھی کرے۔'' (۲۱)

ان کے نمائندہ شاگردوں میں حسن انتظار، نورالہدیٰ نور، صالحہ زرّیں، نگینہ جبیں، ثنا صبوحی، سنجے کمار، نفیس عبدالحکیم، عبدالحی، عارفہ، نیلوفر فردوس، ندا معید، محمد عرفان اور آنند جی راؤ وغیرہ ہیں۔

اسفار:

موجودہ دور میں علی احمد فاطمی ترقی پسند ادیبوں اور ناقدوں میں بہت فعال، متحرک اور ادیب ونقاد کی حیثیت سے اردو دنیا میں مشہور و مقبول ہیں۔ علی احمد فاطمی نے اسی نسبت سے مختلف یونیورسٹیز، ادبی تنظیموں اور انجمنوں کی دعوت پر مختلف ملکوں کا نہ صرف سفر کیا بلکہ اس کی روداد کو سفر نامے کے طور پر قلمبند بھی کیا ہے۔

علی احمد فاطمی بہترین مقرر اور عمدہ ناظم ہیں۔ ان سب کے علاوہ سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کرنا علی احمد فاطمی کا پسندیدہ شیوہ رہا ہے۔ تبھی تو ادبی حلقوں میں علی احمد فاطمی کو ''سمیناری آدمی'' کہا جاتا ہے۔ علی احمد فاطمی کو ادبی محفلوں میں شرکت کے لیے لندن، یورپ، کنیڈا، تاشقند، جرمنی، ماریشس اور پاکستان جیسے ممالک کا سفر درپیش رہا ہے۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء میں لندن میں منعقد ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی پچاسویں سالہ

عالمی کانفرنس ''انجمن ترقی پسند مصنفین گولڈن جبلی'' میں شرکت کے لیےلندن کا سفر کیا۔اس کے بعد ۱۹۹۸ء میں غالب لیکچر کے لیے تاشقند کا سفر کیا۔اور مارچ /۱۹۹۹ء میں عالمی سطح پر جوش ملیح آبادی عالمی سمینار میں شرکت کے لیے پاکستان کا سفر کیا۔علی احمد فاطمی نے اپنے ادبی سفر کو برقرار رکھتے ہوئے جون، جولائی /۲۰۰۱ء میں جوش اور علی سردار جعفری پر دو لیکچر دینے کے لیے کنیڈا کا سفر کیا۔۲۰۰۵ء میں عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے کنیڈا کے ہی شہر ٹورنٹو کا بھی سفر کیا۔ ۲۰۰۶ء میں علی سردار جعفری کانفرنس میں شرکت کے لیے دوسری مرتبہ پاکستان گئے۔انہوں نے عالمی اردو کانفرنس شکاگو(U.S.A) کا سفر جون /۲۰۰۷ء میں کیا۔اور پھر ''بہادر شاہ ظفر عالمی سمینار'' میں شرکت کے لیے جولائی /۲۰۰۷ء میں جرمنی کے برلن شہر کا سفر کیا۔۲۰۱۰ء میں جمیل مظہری عالمی سینار میں شرکت کی غرض سے علی احمد فاطمی تیسری مرتبہ لندن گئے۔عالمی فیض سمینار میں شرکت کی غرض سے جون /۲۰۱۱ء میں تیسری مرتبہ کنیڈا کا سفر کیا۔ عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ۲۰۱۵ء میں ماریشس کا سفر کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے متعدد مرتبہ بیرون ملک کا سفر کیا۔اُن ملکوں میں بحیثیت ترقی پسند ادیب و ناقد پذیرائی حاصل ہوئی۔ بیرون ملک کے علاوہ اندرون ملک میں بھی ادبی محفلوں، کانفرنسوں، جلسوں اور خصوصی لکچر کے لیے الگ الگ یونیورسٹیوں، انجمنوں، تنظیموں اور شہروں کا بھی سفر کیا ہے۔

علمی وادبی خدمات:

علی احمد فاطمی ادب کی دنیا میں اپنی گراں قدر خدمات کی وجہ سے بہت مشہور و مقبول ہوئے اور انہیں مختلف ناموں سے پکارا جانے لگا۔علی احمد فاطمی جب ڈراما ایکٹ کرتے تھے تو وہ ''علی بابو'' کے نام سے مشہور ہوئے۔اور جب وہ بحیثیت ادیب فعال ہوئے اور سمیناروں وجلسوں میں شرکت شروع کی تو وہ ''سمیناری آدمی'' کہلائے۔ پھر جب ان کے دوست غضنفر علی نے ان پر ایک خاکہ ''موبائل آدمی'' کے عنوان سے تخلیق کیا تو وہ اس نسبت سے ''موبائل آدمی'' کہلائے۔اور سمیناروں میں کثیر شمولیت کی وجہ سے ''سفری پروفیسر'' بھی کہلائے۔اس طرح علی احمد فاطمی ادبی دنیا میں متعدد ناموں سے پکارے جانے لگا۔

یہ بات کافی حد تک درست بھی ہے کیوں کہ علی احمد فاطمی ایک وقت میں مشہور نقاد، ادیب، بدنامی کی حد تک ترقی پسند، عمدہ اور اعلیٰ تخلیق کار اور ان کی تنقید میں بھی تخلیقیت ہوتی ہے۔علی احمد فاطمی ایک بہترین منتظم، اور ایک ہر

دلعزیز اور اچھا دوست، اور ایک بے باک مقرر، اور ان سب سے بڑھ کر وہ ایک اچھے انسان ہیں۔

علی احمد فاطمی کا تعلق ادب کے علاوہ اور بھی بہت سی تنظیموں سے رہا ہے، جن میں اسٹوڈینٹ یونین بھی شامل ہے۔ بحیثیت استاد کارناموں پر نظر ڈالیں تو اب تک ان کی زیرنگرانی میں تقریباً ۳۲/ ریسرچ اسکالر ڈی فل (پی ایچ۔ڈی) کی ڈگری سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ اور تقریباً ۳/ پی ڈی ایف اسکالرز بھی ان کی نگرانی میں اپنا تحقیقی کارنامہ انجام دے چکے ہیں۔ ان کے سیکڑوں مضامین ہندو پاک کے متعدد اردو و ہندی و ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ آل انڈیا پی ڈبلیو اے (PWA) کے نائب صدر اور اِپٹا (IPTA) کے جنرل سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

علی احمد فاطمی ان سب کے علاوہ علامہ اقبال اکیڈمی کے کینویز، ادارہ ''نیا سفر'' کے ڈائریکٹر اور ''جوش بانی'' رسالے کے اڈیٹر، الہ آباد کی ایک قومی لائبریری کے منتظم، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری اور ہندوستانی اکادمی الہ آباد کے ممبر رہے اور ساتھ ہی ساتھ بہت ساری کتابوں کا ترجمہ بھی کیا۔ علی احمد فاطمی زمانۂ طالب علمی سے ہی بہت فعال تھے۔ وہ ہر تحریک اور طالب علموں کے مسائل تک ہر جگہ فعال رہتے تھے۔ علی احمد فاطمی ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار، خاکہ نگار، رپورتاژ نگار اور مضمون نگار بھی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر جس کی وجہ سے وہ آج اس بلندی تک پہنچے وہ ہے ان کا ترقی پسند نقاد ہونا۔

تصانیف:

علی احمد فاطمی ادب کے میدان میں زمانۂ طالب علمی سے ہی بہت فعال تھے، اور انہیں بہت فعال اساتذہ بھی ملے، جن کی سرپرستی میں رہ کر انہوں نے ادب کو سمجھا اور سیکھا بھی۔ علی احمد فاطمی انہیں کی متعدد مفید مشوروں پر عمل کرتے ہوئے جلد ہی ادب کی دنیا میں اپنا تعارف کرا لیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد نئی کہانیوں کا بہت شور تھا، اس وقت علی گڑھ میں ایک سمینار تھا، جس میں پروفیسر محمد حسن بھی شریک ہوئے، اور انھوں نے علی احمد فاطمی کو ڈانٹا اور مشورہ دیا کہ تم بیس نئی کہانیوں کا انتخاب کرو۔ انہوں نے پروفیسر محمد حسن کی فرمائش پر ۱۹۷۹ء میں ''بیس نئی کہانیوں'' کا انتخاب کیا، جسے عابد سہیل نے نشرت پبلیشر سے شائع کیا۔ اس طرح علی احمد فاطمی نے ادب کو بیس نئی کہانیوں کا تحفہ دیا اور ادب کی دنیا کو ایک نیا سپاہی بھی ملا، جو ترقی پسند ادب کو ہی اپنی زندگی کا مقصد اولین بنا بیٹھا۔ علی احمد فاطمی اپنی ادبی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں خالص نقاد اپنے آپ کو نہیں مانتا، میں نے افسانے بھی لکھے، رپورٹ اور

رپورتاژ بھی لکھے اور سفرنامے اور خاکے بھی تحریر کیے۔تو کل ملا کر میرے اندر تھوڑی سی تخلیقی حس بھی ہے اور یہ حس میری تنقید میں بھی نظر آتی ہے۔کیونکہ میں بہت گاڑھی تنقید نہیں لکھتا بلکہ تخلیقی تنقید لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' (۲۲)

علی احمد فاطمی آگے تخلیقی سفر میں ہی ۱۹۸۰ء میں سینٹ جانس کالج، آگرہ میں بطور لکچرر مقرر ہوئے۔اور اسی درمیان پریم چند صدی منائی جا رہی تھی، وہیں پروفیسر قمر رئیس سے ان کی ملاقات ہوئی، اسی وقت قمر رئیس نے علی احمد فاطمی کو مشورہ دیا کہ تم الہ آباد جاؤ اور وہاں پریم چند کے بیٹے امرت رائے سے ملو، اور پریم چند کا جو پہلا کہانیوں کا مجموعہ ہے، اسے تم پھر سے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کرو۔اور پھر اس کے بعد علی احمد فاطمی آگرہ سے الہ آباد آئے اور امرت رائے سے مل کر ''سوزِ وطن'' کو نئے انداز سے شائع کرانے کی اجازت لی اور ۱۹۸۰ء میں ہی قمر رئیس نے راجندر سنگھ بیدی کے ہاتھوں اسے ریلیز کیا، جو بہت مشہور ہوا۔

اس طرح علی احمد فاطمی نے ابتدائی چھوٹے چھوٹے کاموں کے بعد ایک مستقل تخلیقی کتاب ''نظیر اکبرآبادی'' تخلیق کی، جو ۱۹۸۱ء میں منظرِ عام پر آئی۔اس کتاب کے بارے میں علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ یہ میری پہلی اوریجنل کتاب ہے۔اس کے بعد جولائی ۱۹۸۳ء میں وہ الہ آباد دوبارہ آ گئے۔اور وہ تقریباً ۴۰ برس تک درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہے۔علی احمد فاطمی ۱۹۸۵ء میں (WHO) لندن میں گولڈن جوبلی کی شرکت کے لیے گئے۔اور وہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۵ء کے وقفے میں پوری طرح سے معروف ہو گئے تھے۔انہوں نے ''ادیب کو قوم کا ضمیر کہا ہے''۔اس کے بعد تو علی احمد فاطمی یکے بعد دیگرے تخلیقات ادب کی دنیا میں لاتے رہے اور مقبولیت کا سہرا اپنے سر باندھتے رہے۔علی احمد فاطمی کی تصانیف کی فہرست طویل ہے، جس پر تفصیلی گفتگو اس مقالے میں ممکن نہیں ہے۔اس لیے یہاں صرف ناموں کی فہرست پیش کر رہا ہوں۔

مرتبہ، تخلیقی و تحقیقی مقالہ جات کتابیں:

۱۔ بیس نئی کہانیاں ۱۹۷۸ء (مرتب)

۲۔ سوزِ وطن ۱۹۸۰ء (مقدمہ و حواشی)

۳۔ نظیر اکبرآبادی ۱۹۸۳ء

۴۔ عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار ۱۹۸۵ء (ڈی فل مقالہ)

۵۔ تاریخی ناول: فن اور اصول (ترتیب)

۶۔ فراق گورکھپوری: فن اور شخصیت ۱۹۸۶ء (ترتیب)

۷۔ انتخاب مضامین شرر (ترتیب)

۸۔ ڈاکٹر اجمل اجملی: حیات اور ادبی خدمات ۱۹۹۲ء (ترتیب)

۹۔ علی سردار جعفری: شخصیت اور فن ۱۹۹۴ء (ترتیب)

۱۰۔ شاعر۔ دانشور: فراق گورکھپوری ۱۹۹۷ء

۱۱۔ جوش ملیح آبادی: نئے تناظر میں ۱۹۹۹ء (مرتب)

۱۲۔ نئی تنقید، نئے اقدار ۱۹۹۹ء

۱۳۔ حرف حرف جنوں ۱۹۹۹ء

۱۴۔ دو ترقی پسند شاعر ۲۰۰۰ء (علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری)

۱۵۔ کلیات علی سردار جعفری ۲۰۰۴ء (پانچوں حصوں کی ترتیب)

۱۶۔ تین ترقی پسند شاعر ۲۰۰۵ء (علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی)

۱۷۔ ترقی پسند تحریک: سفر در سفر ۲۰۰۶ء

۱۸۔ سجاد ظہیر: ایک تاریخ، ایک تحریک ۲۰۰۶ء

۱۹۔ پریم چند: نئے تناظر میں ۲۰۰۶ء

۲۰۔ اقبال اور الہ آباد ۲۰۰۹ء

۲۱۔ وامق جونپوری: شخصیت اور شاعر ۲۰۱۰ء (مرتب)

۲۲۔ فراق گورکھپوری ۲۰۱۰ء (منتخب تحریریں)

۲۳۔ فیض: ایک نیا مطالعہ ۲۰۱۱ء

۲۴۔ مجاز: شخص اور شاعر ۲۰۱۱ء

۲۵۔ کامریڈ منٹو ۲۰۱۲ء

۲۶۔ سید احتشام حسین: ذکر و فکر ۲۰۱۳ء

۲۷۔ باقیات علی سردار جعفری ۲۰۱۴ء (مرتب)

۲۸۔ علی سردار جعفری حیات اور تخلیقی جہات ۲۰۱۵ء

۲۹۔ کرشن چندر: فکر و فن ۲۰۱۵ء

۳۰۔ ناول کی شعریات ۲۰۱۶ء

۳۱۔ سر سید اور ہم ۲۰۱۸ء

۳۲۔ کیفی اعظمی ۲۰۱۸ء

۳۳۔ غالب اور غالب شناس ۲۰۱۸ء

۳۴۔ مرثیے کی جمالیات ۲۰۱۹ء

۳۵۔ سید محمد عقیل: حیات اور کارنامے ۲۰۲۰ء

۳۶۔ پروفیسر سید محمد عقیل: استاد اور نقاد ۲۰۲۰ء

۳۷۔ پروفیسر قمر رئیس تنقید اور تحریک ۲۰۲۰ء

۳۸۔ ادب۔ تہذیب اور الہ آباد ۲۰۲۱ء

سفرنامے :

۱۔ سفر ہے شرط ۱۹۸۶ء (سفرنامہ و رپورتاژ)

۲۔ سات سمندر پار ۲۰۰۳ء (دو سفرنامے: کنیڈا اور تاشقند)

۳۔ جرمنی میں دس روز ۲۰۰۷ء

۴۔ ماریشس میں چند روز ۲۰۱۶ء

رپورتاژ:

۱۔ سفر ہے شرط ۱۹۸۶ء (رپورتاژ و سفرنامہ)

۲۔ جڑیں اور کونپلیں ۱۹۹۴ء

۳۔ یاترا ۱۹۹۶ء

۴۔ نیا مزاج ۱۹۹۹ء

خاکہ:

۱۔ فن اور فنکار (شخصیت نامے) ۲۰۲۱ء

ہندی کتابیں:

۱۔ سم کالین پاکستانی ساہتیہ

۲۔ پریم چند: ایک نیا ادھین ۲۰۱۲ء

۳۔ کامریڈ منٹو (اردو سے ہندی ترجمہ) نفیس عبدالحکیم

علی احمد فاطمی بنیادی طور پر نقاد ہیں لیکن انہوں نے کچھ تخلیقی مضامین بھی لکھے ہیں، جن میں سے راقم الحروف کی رسائی تقریباً ۵۰؍تک ہوسکی۔ یہ سبھی مضامین تاثراتی، تنقیدی اور تحقیقی نوعیت کے ہیں، جو ہندوستان و پاکستان اورلندن وغیرہ کے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے یہ سبھی مضامین ترقی پسندی کی طرح مقصدی نوعیت کے زیادہ ہیں۔ علی احمد فاطمی نئے ناولوں پر خوب تنقیدی مضامین لکھتے ہیں، جن کو پڑھ کر قاری بھی ناولوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

ان سب کے علاوہ علی احمد فاطمی کا ایک اہم پہلو رسالہ جاری کرنے کا ہے۔ علی احمد فاطمی زمانۂ طالب علمی میں ہی تبصروں پر مشتمل رسالہ ''اندازے'' نکالا، جو اس وقت کے نئی کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس رسالے کے تقریباً ۱۵؍شمارے منظرِ عام پر آئے۔ اس کے بعد اقبال حیدر، قمر رئیس اور علی احمد فاطمی نے مل کر جوش لٹریری سوسائٹی، انڈیا اور کنیڈا کے ذریعے رسالہ ''جوش بانی'' نکالا، جو چھ ماہی تھا۔ جس کے تقریباً ۵؍شمارے منظرِ عام پر آئے۔ اقبال حیدر علی احمد فاطمی کے دوست تھے، جو کنیڈا میں رہتے تھے۔ وہ جوش کے بہت بڑے مداح تھے۔ جوش بانی کے آخری شمارے کا عنوان ''ترقی پسند نظم نمبر'' تھا۔ یہ رسالہ صرف ''جوش'' پر مشتمل تھا۔ لیکن یہ رسالہ زیادہ دنوں تک نہیں نکل سکا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ صرف جوش ہی اس کا موضوع تھا۔ علی احمد فاطمی قمر رئیس سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اسے

جوش اور عہدِ جوش پر لائیے لیکن انہوں نے اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا اور آخر میں رسالے کو بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد قمر رئیس اور علی احمد فاطمی نے مل کر ترقی پسند تحریک کی فکری بنیاد پر ایک رسالہ جاری کیا، جس کا عنوان ''نیا سفر'' رکھا۔ اس رسالے کے تقریباً ۲۱ رشمارے منظرِ عام پر آئے اور بہت مشہور ہوئے۔ ان سب کے علاوہ علی احمد فاطمی نے شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی سے ایک مجلّہ ''کاروانِ ادب'' بھی جاری کیا۔

علی احمد فاطمی کی ادبی کاوشیں ہیں۔ اور مستقبل میں دیکھا جائے تو جو ناولوں کے اوپر انہوں نے تبصرے لکھے ہیں، ان مضامین کا مجموعہ لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ افسانوں اور متفرق مضامین کو یکجا کرنے کا قوی ارادہ رکھتے ہیں۔ علی احمد فاطمی کا اکبر الہ آبادی پر ایک بڑا اور منظّم کام کرنے کا ارادہ ہے۔

انعامات واعزازات:

علی احمد فاطمی کی علمی وادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں مختلف انعامات واعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ان کے پانچ مختلف کتابوں پر ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۶ء، ۱۹۹۴ء، ۱۹۹۸ء اور ۲۰۱۰ء میں اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی جانب سے اعزازات سے نوازا گیا۔ علی احمد فاطمی کی ترقی پسند تحریک کے خدمات سے متاثر ہو کر آل انڈیا ترقی پسند مصنفین نے ۱۹۸۶ء میں ''نشانِ سجاد ظہیر'' ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۹۱ء میں لکھنؤ کے مختصر کہانیوں کے سیمینار میں اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے جانب سے گورنر ستیہ نارائن ریڈی نے علی احمد فاطمی کو ''میڈل ایوارڈ'' سے سرفراز کیا۔ ان کو آل انڈیا میر اکیڈمی، لکھنؤ کی جانب سے ۱۹۹۷ء میں ''امتیازِ میر ایوارڈ''، اگست ر ۱۹۹۷ء میں ہی عالمی اردو کانفرنس دہلی کی جانب سے ''فراق ایوارڈ''، ۲۰۱۵ء میں آل انڈیا کیفی اعظمی اکیڈمی، لکھنؤ کی جانب سے ''کیفی اعظمی ایوارڈ''، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی جانب سے ۲۰۱۵ء میں ہی ''پریم چند ایوارڈ'' سے بھی نوازا گیا۔ علی احمد فاطمی کو غالب اکادمی، دہلی کی جانب سے ۲۰۱۶ء میں اردو تحقیق وتنقید پر ''غالب ایوارڈ''، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ سے ۲۰۱۹ء میں ''راہی معصوم رضا ایوارڈ'' اور حال ہی میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال سے ۲۰۲۱ء میں ''اقبال سمان'' سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں علی احمد فاطمی ادبی دنیا میں کئی تنظیموں سے مختلف اعزازات وانعامات سے نوازے گئے۔

حوالہ جات

۱۔ علی احمد فاطمی، احتشام حسین۔ ذکر و فکر، ص: ۱۵۲،۱۵۳

۲۔ ایضاً، ص: ۱۵۲

۳۔ ایضاً، ص: ۱۵۴

۴۔ ایضاً، ص: ۱۶۱،۱۶۲

۵۔ ایضاً، ص: ۱۶۰،۱۶۱

۶۔ محمد شمیم، شخصی انٹرویو، علی احمد فاطمی، الہ آباد، ۶/جون ۲۰۲۰ء

۷۔ علی احمد فاطمی، قاضی عبدالستار ''پالا ہوا ہے وہ نسیم بہار کا'' (خاکہ)، ص: ۸۲

۸۔ ڈاکٹر شبیہ صغرا، پروفیسر فضل امام: ادبی سفر کے ساٹھ سال، ص: ۷۷،۷۸

۹۔ ایضاً، ص: ۷۶

۱۰۔ ایضاً، ص: ۷۷،۷۸

۱۱۔ غضنفر، سرخ رو (خاکوں کا مجموعہ)، ص: ۸۰

۱۲۔ ایضاً، ص: ۸۱

۱۳۔ عبدالصمد، دوستوں کا دوست (خاکہ)، ص:۔۔

۱۴۔ غضنفر، سرخ رو (خاکوں کا مجموعہ)، ص: ۸۰،۸۱

۱۵۔ ایضاً، ص: ۸۵

۱۶۔ محمد معاز، علی احمد فاطمی کے سفرناموں اور خاکوں کا تنقیدی جائزہ (مقالہ)، حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، ص: ۲۰

۱۷۔ ایضاً، ص: ۲۱

۱۸۔ ایضاً، ص: ۲۱

۱۹۔ عبدالصمد، دوستوں کا دوست (خاکہ)، ص:۔۔

۲۰۔ غضنفر، سرخ رو (خاکوں کا مجموعہ)، ص: ۸۲
۲۱۔ محمد شمیم، شخصی انٹرویو، علی احمد فاطمی، الہ آباد، ۶/جون ۲۰۲۰ء
۲۲۔ ابن کنول: کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے)، ص: ۱۴۵، ۱۴۶

☆☆☆

باب دوم

سفرناموں کی روایت

سفرناموں کی روایت

زندگی ایک سفر ہے اور انسان ایک مسافر۔اس طرح ہر شخص کی روداد زندگی خود بہ خود ایک منفرد سفر نامے کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔اس کائنات میں ہر انسان کو سفر کرنے کا اختیار ہے۔ وہ قدرت کا پابند ہوتے ہوئے بھی آزاد ہوتا ہے۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اجالے کی طرف قدم بڑھائے یا اندھیرے کی طرف، کیونکہ اس کا ہر قدم اسے اپنی منزل سے ہمکنار کرتا ہے۔حضرت آدمؑ سے سفر کی ابتدا ہوئی اور یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ جتنے بھی انبیائے کرام، صحابہ، محدثین وفقہا، مبلغین وصوفیاء اور مصلحین تشریف لائے ان تمام لوگوں نے سفر کیا تھا اور اپنے سفر کے ذریعے اپنی دعوتِ تبلیغ کو عام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کا سفر کیا۔اولیائے کرام نے بھی متعدد ممالک کے سفر کیے۔اردو کے ادباوشعرا نے بھی سفر کیے۔غالبؔ نے کلکتہ کا سفر کیا۔اقبالؔ نے مشرق سے مغرب کا سفر کیا۔مہاتما گاندھی نے افریقہ کا سفر کیا۔

علم اور سفر کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سرزمیں پر انسانی زندگی کے ساتھ ہی سفر کی بھی ابتداء ہوئی۔ جیسے جیسے انسان مہذب ہوتا گیا اس نے اپنے سفر کی روداد کو بھی محفوظ کرنا شروع کر دیا اور جیسے جیسے تحریر وتقریر کے وسائل میں ترقی ہوتی گئی سفر ناموں کی تحریری شکل بھی وجود میں آنے لگی۔ سفر نامے کی ابتداء سفر سے ہوتی ہے، کیونکہ سفر نامے کے لیے سفر ایک شرط ہے۔

سفر نامہ ''سفر'' سے مشتق ہے، جو عربی زبان سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر کرنا یا کوچ کرنا۔ سفر نامہ کو ہندی میں ''یاترا ورتانت'' اور انگریزی میں Travelogue کہا جاتا ہے جب کہ عربی میں سفر نامہ کو ''**محاضرہ مصورہ عن رحلتہ**'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ''مصور سفر نامہ'' ہے یعنی ایسے سفر نامے پر مشتمل ڈائری جس میں حالات و واقعات کے ساتھ تصویریں ہوں۔ مذہبِ اسلام نے سفر کو'' کامیابی کی کنجی'' قرار دیا ہے اور سر سید احمد خاں نے سفر کو ''وصیلۂ ظفر'' کہا ہے۔ محمد

حماد کریمی ندوی سفر نامہ کی تعریف اس طرح پیش کرتے ہیں:

''عربی زبان سے ماخوذ لفظ ''سفر'' کے ساتھ فارسی لفظ ''نامہ'' لگانے سے مرکب ''سفر نامہ'' بنا۔ ''سفر'' کوچ کرنے اور اپنے مقام سے کسی اور جگہ جانے کو کہتے ہیں اور ''نامہ'' خط کو کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں روزنامچہ، ڈائری یا بیاض کے، جس میں بالعموم سفر کے مشاہدات و حالات تاریخ وار درج کئے جاتے ہیں۔''
(۱)

انسانی فطرت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دورانِ سفر پیش آنے والی روداد دوسروں تک پہنچے اور لوگ اس کے سفری حالات سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ انسان کی یہی خواہش اسے سفر نامہ لکھنے پر مستعد کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہلِ قلم نے جب بھی کسی مقام کا سفر کیا تو اپنی رودادِ سفر کو سفر نامے کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ محمد شہاب الدین اپنی تصنیف ''اردو میں حج کے سفر نامے'' میں سفر نامے کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''سفر نامہ وہ بیانیہ صنف ہے جس میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر مشاہدات، واقعات، تجربات اور قلبی تاثرات کو تحریر کرتا ہے۔'' (۲)

سفر انسانی زندگی کو سنوارنے اور مرتب کرنے کی کوشش کا ایک سلسلہ ہے۔ اس لیے سفر انسانی زندگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اور سفر سے ہی انسانی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے۔ سفر سے انسان کے تجربات میں وسعت اور علم و عمل میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان سفر کرتا ہے تو اسے دوسرے ملکوں کی تاریخ و تہذیب، ثقافت و معاشرت، رہن سہن، رسم و رواج، تعلیم و تربیت، سیاسی اور انتظامی امور سے واقفیت ہوتی ہے۔ سفر کی اہمیت و افادیت کا اندازہ نامور ادیب اور سیاسی رہنما امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''میں نے آدھا علم سفر سے حاصل کیا۔ مطالعہ کی تنہائیوں نے مجھے ذہنی بالیدگی بخشی لیکن سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی۔ جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔ سفر انسان کو قوموں کی سرگزشت اور ملکوں کی تاریخ کا بلاواسطہ علم بخشتا ہے جس طرح سائنس کے معلموں میں حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح سفر سے صفات انسانی کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے اور مختلف اقوام کے مزاج و طبائع کا پتہ چلتا ہے۔'' (۳)

سفرنامے میں سفرنامہ نگار سفر کے حالات وواقعات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے قلبی جذبات واحساسات کو بھی دلنشین انداز میں بیان کرتا ہے۔اردو،عربی اورانگریزی لغات میں پیش کردہ تعریف کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے ناقدین کی تحریروں میں بھی پیش کردہ تعریف کا مطالعہ ضروری ہے۔مختلف ادباوشعرااورناقدین نے سفرنامہ کی تعریف متعین کرنے میں اپنے انفرادی خیالات کو پیشِ نظر رکھا ہے،جس کی وجہ سے سفرنامہ کی کوئی ایک تعریف متعین کرنا،جس پر تمام ناقدینِ فن متفق ہوں ممکن نہیں ہے۔سفرنامہ کے فن وارتقاء پر جن محققین نے مختلف کتابیں تصنیف کی ہیں ان میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی بہت اہم ہیں۔ڈاکٹر قدسیہ قریشی اپنی تصنیف ''اردوسفرنامے انیسویں صدی میں'' میں سفرنامے کی تعریف اس طرح بیان کرتی ہیں:

> ''سفرنامہ مثبت یامنفی جذبات وخیالات واثرات کا مرکب ہے۔سفرنامہ حالات اور واقعاتِ سفر کا مربوط اور مکمل بیان ہوتا ہے۔اس طرح سفرنامہ وہ طرزِ تحریر اوراسلوب بیان ہوا جس میں انسان یا سیاح اپنے داخلی احساسات،خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی،دلی اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے۔'' (۴)

سفرنامہ کے فن وارتقاء پر ایک وقیع کام ڈاکٹر انور سدید نے کیا ہے۔انور سدید کی تصنیف ''اردو ادب میں سفرنامہ'' سفرناموں کی کتابیات کا جامع نمونہ ہے۔ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے:

> ''فنی طور پر سفرنامہ وہ بیانیہ ہے جو سفرنامہ نگار سفر کے دوران یا اختتامِ سفر پر اپنے مشاہدات،کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔اس صنفِ ادب کے تمام تر مواد موجود منظر کے گردوپیش میں بکھرا ہوتا ہے۔لیکن واضح رہے کہ سفرنامہ نگار صرف خارجی ماحول کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیہ کو مدلل اور ہمہ جہت بنانے کے لئے بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔سفرنامہ نگار کی آنکھ جتنی باریک بیں ہوگی جزئیات اتنی ہی تفصیل سے اس کے مشاہدے میں آئیں گی۔'' (۵)

ڈاکٹر خالد محمود اپنی تصنیف ''اردوسفرناموں کا تنقیدی مطالعہ'' میں سفرنامے کے فن کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''سفرنامہ نگار دورانِ سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات و

احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے وہ سفر نامہ ہے۔'' (٦)

سید محمد عقیل رضوی سفر نامے کے فن اور تعریف پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے سفر نامہ ''لندن اولندن'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''سفر نامہ کیا ہے؟ کچھ تو تجربات جو مسافر نے اپنے دوران سفر کیے تھے۔ کچھ عجائب وغرائب جو سیر و سفر کرنے والے نے دیکھے۔ اور کچھ مقامات کی دلفریبی، مختلف مما لک میں زندگی بسر کرنے والوں کے سماجی حالات، اور ان کے رسم و رواج، ان کی پسند و ناپسند کا بیان۔ اب یہ بیان سفر کرنے والے کی اپنی بصیرت و بصارت دونوں پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر انہیں بیان کرنے کی اس میں کتنی قدرت ہے، وہ صرف مقامات کا احاطہ کرتا ہے یا ان مقامات کے گرد و پیش، ان کی تاریخ ان کے ادب اور ان کی زندگی کے کیف و کم کو اپنے سفر کی مدد سے بیان کرتا ہے۔'' (٧)

یہ سچ ہے کہ سفر نامہ لکھنے کے لیے سفر کی شرط اوّلین ہے اور غالباً یہی شرط اسے رپورتاژ اور آپ بیتی وغیرہ سے الگ کرتی ہے۔ عمومی طور پر سفر نامہ ایک ایسا بیانیہ ہے جو قاری کے اندر شوقِ سیاحت کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔ سفر نامہ صرف سفر نامہ نگار کے سفری تاثرات، احساسات، جذبات اور تجربات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ علوم کا ایک وسیع خزانہ بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ سفر نامے کا تعلق غیر افسانوی ہونے کے باوجود اس میں چشم باطن سے خارج کا مشاہدہ دلکش نثری اسلوب میں پیش کیا جاتا ہے۔

سفر نامہ کسی مخصوص تکنیک یا کسی خاص اصول کا پابند نہیں ہوتا بلکہ سفر نامہ نگار کا مزاج اور طرز تحریر ہی سفر نامے کا اصول، اسلوب اور تکنیک واضح کر لیتا ہے۔ ایک اچھا تخلیق کار جب سفر نامہ لکھتا ہے اور اپنے جذبات واحساسات کو لفظی پیکر عطا کرتا ہے اور سفر کے حالات و یادداشت کو ادبی زندگی میں قلمبند کرتا ہے تو اس میں اس کی تخلیقی صلاحیت، حسنِ لطافت اور قوتِ مشاہدہ شامل ہوتی ہے، تبھی وہ سفر نامہ اپنے فن پر کھرا اترتا ہے۔ سفر نامے میں سیاح سفر کے چشم دید واقعات واحساسات کو کچھ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ قاری بھی سفر نامہ نگار کے خارجی و داخلی جذبات کو محسوس کرنے لگتا ہے۔ سفر نامہ میں ایک قسم کی دلکشی اور خارجیت بھی ہوتی ہے اور اس رودادِ سفر میں قاری بھی اپنے آپ کو

شریکِ سفرمحسوس کرتا ہے۔یہی سفرنامہ کی خصوصیت ہے۔گویا سفرنامہ نگار آزاد ہوتا ہے جس طرح چاہے اپنے تجرباتِ سفرتحریر کرے۔مگر یہ خیال ضرور رہے کہ سفرنامے کوسفرنامہ ہی رہنے دے داستان،ناول یا افسانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔سفرنامہ نگارکو چاہئے کہ سفرنامہ کا اندازِتحریر شگفتہ اور سادہ ہولیکن اتنا ہلکا اور روکھا بھی نہ ہوکہ ذہن کی گرفت میں نہ آسکے۔ڈاکٹر خالد محمود اپنی تصنیف ''اردوسفرناموں کا تنقیدی مطالعہ'' میں سفرنامے کے فن اور تکنیک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سفرنامہ نگار سفرنامے کے مطالبات کو اپنے مخصوص طرزِ نگارش کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔گویا سفرنامہ نگار آزاد ہے کہ جس طرح چاہے اپنے تجرباتِ سفرتحریر کرے مگر یہ خیال ضروری ہے کہ سفرنامہ کوسفرنامہ ہی رہنے دے داستان،ناول یا افسانہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔سفرنامہ میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے خواہ مخواہ کی رنگین بیانی، افسانویت،مبالغہ آرائی پر اسرار بنانے کی شعوری کاوش یا بے موقع لطائف وغیرہ سفرنامہ کی روح کو مجروح کر دیتے ہیں۔اور ایسا سفرنامہ نامعتبر خیال کیا جاتا ہے۔''
> (۸)

سفرنامہ ایک بیانیہ صنف ہے جس کا تعلق غیر افسانوی ادب سے ہے۔سفرنامے کا مرکزی کردار خود سیاح ہوتا ہے۔سفرنامہ میں مسافر دورانِ سفر پیش آنے والے حادثات وواقعات،مشاہدات وتجربات اور احوال وکوائف کا ذکر کرتا ہے۔اور راہ میں پیش آنے والے اپنے استعجاب واضطراب اور تمام حالاتِ سفرکو اس طرح قلم بند کرتا ہے کہ قاری کی نظروں میں سفر کے سارے مناظر آجائیں۔اور وہ انہیں پڑھ کر یہ گمان کرنے لگے کہ گویا وہ بھی سفر کا ایک حصہ ہے۔

سفرنامہ ادب کی انتہائی نازک صنف ہے،کیونکہ یہ صنف کوئی ایک پہلو پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ مختلف الجہات اور کثیرالانواع حیثیات کی حامل ہوتی ہے۔سفرنامے کی خوبی اور عمدگی کا کچھ حد تک انحصار سفر کرنے والے کی مزاجی کیفیت،اندازِتحریر،قوتِ مشاہدہ،اندازِ بیان اور طرزِ تفہیم پر بھی ہوتا ہے۔سفر کرنے والا جس قدر سنجیدہ اور فکر کا حامل ہوگا ،اسی قدر اس کی فکری سنجیدگی کا اثر اس کے سفرنامے میں ہوگا۔سفرنامے کے مطالعے سے قاری کو وہی مسرت حاصل ہوتی ہے،جو کسی بھی نثر پارے کے مطالعہ سے ایک قاری کو حاصل ہوتی ہے۔جب ایک اچھا تخلیق کار سفرنامہ تحریر کرتا ہے تو اس کے تخلیقی جوہر سفرنامے کے لیے ایک ایسا اسلوب واضح کر لیتا ہے،جس کی سفرنامہ کو بہت زیادہ ضرورت ہوتی

ہے۔سفر نامہ میں طنز ومزاح کی شدت کی گنجائش بھی نہیں ہے، کیوں کہ اگر سفر نامہ ہنسی و مذاق بن جائے تو سفر نامہ کا مقصد پسِ پردہ چلا جاتا ہے۔سفر نامے میں بھاری بھرکم زبان اور انشاء پردازی کے مظاہرہ کی گنجائش بھی موجود نہیں ہوتی ہے۔مرزا حامد بیگ سفر نامے کے فن و تکنیک پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی تصنیف ''اردو سفر نامہ کی مختصر تاریخ''، میں لکھتے ہیں:

> ''خارج سے متعلق بیانیہ اصناف ادب میں سفر نامہ سرِ فہرست ہے، لیکن شاید سفر نامہ واحد نثری صنف کا اظہار ہے جس کی تکنیکی تعریف کا تعین تا حال ممکن نہیں ہو سکا۔ کچھ یہی سبب ہے کہ سفر نامہ کبھی روز نامچے کے رنگ میں لکھا گیا اور کبھی خطوط کی شکل میں، اس میں مطالعے کی شمولیت بھی ممکن ہے، اور اس میں خبر پہنچانے کا انداز بھی کھپ جاتا ہے۔ پس منظر کا سفر نامہ اسلوبی سطح پر ''نان فکشن'' رہتے ہوئے بھی فکشن کا انداز اختیار کر گیا ہے۔'' (۹)

فنی اعتبار سے سفر نامہ ایک ایسی صنف ادب ہے، جس میں اسلوب کے نئے تجربات کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔قدیم اسلوب کا انداز بیانیہ تھا۔آج بھی اس کے فن میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔متفرق اسالیب اور مختلف سفر ناموں کے طرز بیان کے اختلاف کے باوجود نئے دور کا سفر نامہ بھی بیانیہ انداز میں لکھا جا رہا ہے۔سفر نامہ میں ایک سیاح اپنے تجربات و مشاہدات خود بیان کرتا ہے۔اس لیے سفر نامہ ایک قسم کی آپ بیتی بن جاتا ہے۔رودادِ سفر کو محفوظ کرنے کے لیے سفر نامہ نگار مختلف طریقہ اختیار کرتا ہے۔

سفر نامے کی تکنیک کے بارے میں بہت سے ناقدین اس آراء پر متفق ہیں کہ سفر نامہ کی تکنیک میں بہت زیادہ تجربوں کی گنجائش موجود نہیں ہے۔سفر نامہ واحد نثری صنفِ اظہار ہے، جس کی تکنیک کا تعین تا حال ممکن نہیں ہو سکا ہے۔غرض یہ کہ جب سفر نامہ نگار یہ سوچ کر سفر کرتا ہے کہ سفر کے ساتھ ساتھ سفر نامہ بھی تحریر کرنا ہے تو وہ اپنے پسند اور سہولت کے مطابق تکنیک خود وضع کر لیتا ہے۔اردو میں سفر نامہ نگاری کی عمر تقریباً دو سو برس سے کچھ زیادہ ہے اور اس درمیان سفر ناموں میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے ان میں ذیل کی تین شکلیں زیادہ تر رائج ہیں۔

۱۔ روز نامچہ تکنیک

۲۔ خطوط تکنیک

۳۔ پسِ سفر تکنیک

ان تینوں تکنیک کی اپنی اہمیت وافادیت ہے۔ یہ سفرنامہ نگار پر منحصر ہے کہ وہ کون سی تکنیک استعمال کرتا ہے۔ اگر سفرنامہ نگار روزنامچہ تکنیک، خطوط تکنیک یا پسِ سفر تکنیک کے تقاضوں کا خیال رکھے تو کسی بھی منتخب تکنیک میں بہترین انداز سے سفرنامہ تحریر کیا جاسکتا ہے۔

اردو زبان میں دوصدی سے زائد عرصے سے سفرنامے تحریر کیے جارہے ہیں۔اس عرصے میں اردو میں مختلف انواع واقسام کے سفرناموں کا سرمایہ جمع ہو چکا ہے۔صنف سفرنامہ پر موجود تنقیدی کتب میں سفرناموں کی تقسیم متعدد لحاظ سے کی گئی ہے۔ کسی نے سفرنامہ کی تقسیم سیاحت کردہ مقامات کے لحاظ سے کی ہے، کسی نے بِراعظموں کے لحاظ سے کی ہے جیسے بِرعظیم ایشیاء کے سفرنامے اور افریقہ کے سفرنامے وغیرہ مقامات سیاحت کی وجہ سے سفرنامے کی تحریر میں زیادہ فرق نہیں پڑتا ہے۔لندن کا سفر ہو چاہے پیرس یا ایران وعراق کا سیاحت کردہ مقامات کی تفصیل اور ضمنی باتیں، سفرنامے پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی۔ سفرناموں کی ایک تقسیم موضوعات کے لحاظ سے بھی کی گئی ہے جیسے سیاسی سفرنامے، سماجی سفرنامے اور تاریخی وجغرافیائی سفرنامے وغیرہ۔موضوعات کے لحاظ سے سفرناموں کی تقسیم کرنا بھی زیادہ درست نہیں ہے کیونکہ ایک اچھے سفرنامے میں سیاحت کردہ ملک کی تاریخی، سماجی اور معاشرے کی مکمل تصویر پیش کی جاتی ہے۔سفرناموں کی ایک تقسیم تکنیک کے لحاظ سے بھی کی گئی ہے جیسے خطوط کی تکنیک، روزنامچہ تکنیک اور پسِ سفر تکنیک میں تحریر کردہ سفرنامے۔غرض کہ مختلف ناقدینِ ادب نے سفرناموں کی تقسیم اپنی سہولتوں کے لحاظ سے کی ہے۔ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے اپنی تصنیف ''اردو سفرنامے انیسویں صدی میں'' میں سفرنامے کو حسب ذیل چار اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ یورپ کے سفرنامے

۲۔ مشرقی سفرنامے

۳۔ مذہبی سفرنامے

۴۔ مقامی سفرنامے

سفرناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے سفرناموں کی تقسیم ضروری ہے۔بغیر کسی اصول وقواعد اور پیمانے کے ہم سفرنامے کا تنقیدی جائزہ نہیں لے سکتے۔اس لیے مقالہ نگار نے بھی سفرناموں کو تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ

مختلف اقسام کے سفر ناموں کو اس کے اصول وضوابط کے لحاظ سے جانچا جائے اور سفر ناموں کی روایت کا تنقیدی جائزہ لیا جاسکے۔ سفر نامے کے فن اور روایت کا مطالعہ کرنے کے بعد سفر ناموں کو ذیل کے مطابق تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) تاریخی سفر نامے

(۲) مذہبی سفر نامے (حج نامے)

(۳) سیاسی سفر نامے

(۴) تعلیمی وعلمی سفر نامے

(۵) علماء اکرام کے سفر نامے

(۶) اندرون ملک کے سفر نامے

(۷) بیرونی ممالک کے سفر نامے

(۸) منظوم سفر نامے

(۹) طنزیہ ومزاحیہ سفر نامے

(۱۰) خیالی یا افسانوی سفر نامے

(۱۱) تراجم شدہ سفر نامے

اوپر درج کیے گئے مختلف اقسام کے سفر نامے فنی لحاظ سے انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کی تعریف بہ آسانی کی جا سکتی ہے، کیوں کہ درج کردہ اقسام کے سفر نامے اپنا الگ مزاج رکھتے ہیں اور ان کی انفرادی مزاج کی بنیاد پر سفر ناموں کی فنی خوبیوں کا محاکمہ کیا جاسکتا ہے۔ دراصل سفر نامہ اپنی حیثیت کے لحاظ سے سفر کے ذریعے سیاحت کے مقامات کا انتخاب کرتا ہے۔ ہر سفر نامہ نگار کا اپنا نقطۂ نظر ہوتا ہے اور وہ اپنا ایک مخصوص رجحان رکھتا ہے۔ اس طرح سفر نامہ نگار اپنے رجحان اور مقصد کی تکمیل کے لیے سفر نامہ تحریر کرتا ہے، جس کی وجہ سے مختلف اقسام کے سفر نامے وجود میں آتے ہیں۔ ان تمام سفر ناموں کی اپنی اہمیت وانفرادیت ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ابتداء میں سفر ناموں کو تاریخ کا حصہ سمجھا جاتا تھا، لیکن جیسے جیسے اس صنف میں ترقی ہوتی گئی سفر نامے کو ادب میں ایک اہم حصے کے طور پر قبول کیا گیا۔ دراصل ابتدائی دور کے سفر ناموں میں مختلف ممالک کی تاریخ، تہذیب وثقافت

اور جغرافیائی حالات کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔جن سیاحوں نے سفرنامے قلم بند کیے وہ مورخ تھے اور ان کی تصانیف کو تاریخ میں اہم مقام حاصل ہوا۔فاہیان، ہیون سانگ، البیرونی اور ابنِ بطوطہ جیسے سیاحوں کا تعلق تاریخ سے ہی رہا ہے۔اس زمانے میں جغرافیائی حالات کے بیان کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی تاکہ اپنے ہم وطنوں کو ان دشوار گزار راستے سے گزرنے والے سیاحوں اور مسافروں کو موسم و حالات کا پتہ چل جائے۔ابتدائی دور میں ایسے سفرنامے جن میں تاریخی و جغرافیائی حالات کی تفصیل بیان کی گئی تھی زیادہ مقبول ہوئے اور عوام نے ان کی بڑی قدر کی اور ان کی تحریروں سے لوگوں نے استفادہ بھی کیا۔اس طرح سفرناموں میں تاریخی و جغرافیائی حالات کے بیان کو ایک اہم حصہ سمجھا جانے لگا۔آج تاریخی و جغرافیائی حالات کا بیان سفرنامے کے لوازمات میں شامل ہے۔بعض ناقدین یا سفرنامہ نگاروں نے تاریخی و جغرافیائی حالات کے بیان کو ضروری نہیں سمجھا ہے۔یہ بات بالکل صحیح ہے، لیکن جن لوگوں نے سفر نہیں کیا ان کو تاریخی و جغرافیائی حالات کی شناسائی سے سفرنامے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ہر منظر اپنے پس منظر سے جڑا ہوتا ہے۔اس لیے سفرنامہ نگار کو چاہئے کہ وہ اپنے سفرنامے میں مختصر انداز میں ہی سہی تاریخی و جغرافیائی حالات کو پیش کرے۔

سفرناموں میں تہذیب و ثقافت کی مرقع کشی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔جب کوئی سیاح کسی نئے ملک کی سیر پر جاتا ہے، وہاں کی سیر کرتا ہے اور لوگوں کو رودادِ سفر میں شامل کرتا ہے تو اس میں یقیناً سیاحت کردہ ملک کی تہذیب و ثقافت کا بیان شامل ہو جاتا ہے۔چوں کہ تہذیب و ثقافت کے بیان کے بغیر سفرنامہ مکمل نہیں ہوسکتا۔سفرنامے میں کسی خاص عہد کی زندگی، معاشی اور ثقافتی حالات کا براہ راست اظہار ضروری ہوتا ہے۔دراصل سفرناموں کو کسی بھی عہد کے سماجی و ثقافتی حالات کو جاننے کا بنیادی ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔سفرنامہ ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں سیکڑوں سال کے سیاسی اور تہذیبی و تمدنی حالات دکھائی دیتے ہیں۔تاریخی سفرناموں میں ابنِ بطوطہ کے سفرنامے کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس کی وجہ یہی ہے کہ اس میں تہذیب و ثقافت کی تمام تفصیل موجود ہے۔

سفرنامے کی ابتداء کے بارے میں تحقیقی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ پہلا باضابطہ سفرنامہ کب اور کہاں لکھا گیا اور یہ کس نے تحریر کیا؟ اگر ہم عالمی پس منظر میں سفرناموں کی ابتداء کا باضابطہ جائزہ لیں تو کچھ محققین نے یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) کو اولین سفرنامہ نگار مانا ہے۔انہوں نے تاریخ اور سفرنامے کی عمارت کی

تعمیر کو ۴۸۵ قبل مسیح میں انجام دیا ہے۔ ہیروڈوٹس کو بابائے تاریخ، ایک عظیم مورخ اور سفر نامہ نگار بھی کہا جاتا ہے۔ تاہم اس کے سفر نامے کے بارے میں زیادہ معلومات ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔

ہندوستان صدیوں سے تاریخی وجغرافیائی اعتبار سے نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے، جس کی وجہ سے زمانہ قدیم سے ہی یہ ملک غیر ملکیوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ خواہ وہ آریہ ہوں یا عرب، ترک ہوں یا افغانی، پرتگالی، فرانسیسی یا انگلستانی سبھی قوموں نے ہندوستان میں دلچسپی لی ہے۔ تاریخی ادوار میں مختلف سیاحوں اور مورخین نے ہندوستان کی سیر کی اور اپنے سفر کی روداد میں یہاں کے اہم مقامات، قدیم تہذیب، علمی وادبی کمالات اور فنون لطیفہ کے شاہکاروں کے حوالے سے اہم حقائق کو اپنے سفر ناموں میں قلمبند کیا ہے۔ ان سفر ناموں میں ہمیں ہندوستانی تہذیب وثقافت، سماج اور تاریخ کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ ذیل میں چند سیاحوں اور ان کے سفر ناموں کا احاطہ کیا جارہا ہے تاکہ عالمی پس منظر میں دنیا کے چند اہم سفر ناموں کی روایت کا جائزہ لیا جاسکے۔

ہندوستان میں وارد ہونے والے سیاحوں کے سفر ناموں کا آغاز دنیا کا سب سے پہلا دریافت شدہ باقاعدہ سفر نامہ یونانی سیاح میگس تھنیز (Megasthenes) کے سفر سے ہوا۔ میگس تھنیز کے تحریر کردہ سفر نامہ INDICA ''سفر نامہ ہند'' ہے، جو ہندوستان کے سفر کے حالات پر مشتمل ہے، جسے دنیا کی قدیم ترین سفر ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ میگس تھنیز ۳۰۰ قبل مسیح میں یونانی راجہ سیلوکس کے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان میں وارد ہوا تھا۔ اس وقت یہاں پر گپت موریہ کی حکومت قائم تھی، جس کا دارالحکومت پاٹلی پتر موجودہ ''پٹنہ'' تھا۔ میگس تھنیز نے اپنے سفر نامے میں ہندوستان کی آب وہوا، یہاں کی زرخیز زمینوں، موسم اور فصل وغیرہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، تمدنی، جغرافیائی اور تاریخی واقعات کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے۔ محققین کا اتفاق ہے کہ یہ سفر نامہ انتہائی معلوماتی اور کارآمد ہے۔ نیز یہ ایک تاریخی ماخذ بھی مانا گیا ہے۔ لیکن اس کے لکھے ہوئے واقعات سے بہت سے مورخین نے استفادہ کیا ہے۔ اس کے سفر نامے سے چہار صدی قبل مسیح کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، اور اقتصادی حالات کا پتہ چلتا ہے۔

تاریخی سفر ناموں کی فہرست میں بدھ مت کے سیاحوں کے سفر ناموں کو خاص مقام حاصل ہے۔ مہاتما بدھ کی جائے پیدائش ہندوستان میں ہونے کی وجہ سے چینی اور جاپانی بودھسٹوں کے لیے یہ مقام قدیم زمانے سے ہی تقدس اور

عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی کی ابتداء میں چینی راہب فاہیان (Fahsien) نے بدھ مذہب کی نشانیوں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ فاہیان میگس تھنیز کے سفر کے ۷۰۰ رسال بعد ہندوستان آیا۔ اس نے اپنی کتاب ''بدھ حکومت کے حالات'' میں ہندوستان کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ فاہیان کا سفر مذہبی نوعیت کا تھا۔ اس کا مقصد بُدھ مت کی تعلیم اور کتابوں کے نقول حاصل کرنا تھا۔ اس لیے فاہیان نے ہر چیز کا مشاہدہ مذہبی نقطۂ نظر سے کیا۔ فاہیان راجہ بکرماجیت کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے کپل وستو، پاٹلی پتر، ویشالی اور کشی نگر کے حالات کو اپنے سفرنامے میں قلمبند کیا ہے جس میں ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی احوال درج ہیں۔ جسے مورخین ایک اہم تاریخی ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں راجہ ہریش چندر کے دورِ حکومت میں مزید ایک چینی سیاح ہوین سانگ (Huen Tsang) ہندوستان آیا۔ اس نے ۶۳۰ء تا ۶۴۵ء تک پندرہ سال کا عرصہ ہندوستان میں گزارا۔ ہیون سانگ نے پوری آزادی کے ساتھ ہندوستان کی سیاحت کی۔ ہوین سانگ نے ایک کتاب بعنوان ''مذہب اور تلاش حق'' لکھا۔ اس کتاب میں انہوں نے ہندوستان کے معاشرتی احوال کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کا بھی مقصد بُدھ مت کی تلاش کرنا تھا۔ ہوین سانگ مئی ۶۳۱ء تا اپریل ۶۳۳ء تک کشمیر میں رہا۔ اس نے ہندوستان کی تمام علمی مراکز بطور خاص سوات، کابل، مگدھ اور نالندہ یونیورسٹی کی سیاحت کی۔ اس کے سفرناموں سے عوام کے مذہبی رجحانات، شادی وغموں کی رسمیں اور جادوٹونے غرض کہ ہر طرح کی معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے سفرنامے کو تمام مورخین نے ایک اہم تاریخی ماخذ تسلیم کیا ہے۔ اس سفرنامے کا اولین اردو ترجمہ ''سفرنامہ ہیون ٹی شیانگ'' کے نام سے پنجاب ریلجیئس بک سوسائٹی، لاہور نے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ اس سفرنامے کا دوسرا ترجمہ ''ہندوستان پر چینی سیاح کے خیالات'' کے نام سے نیر بک ایجنسی، مرادآباد نے شائع کیا جس پر سنِ طباعت درج نہیں ہے۔ یہ سفرنامہ ۲۹۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامے کا تیسرا ترجمہ ''چینی سیاح کا سفرنامہ'' کے نام سے مترو بک کمپنی، لاہور نے تقریباً ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ سفرنامہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں اس سفرنامے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

ہندوستان کے تہذیبی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات قدیم زمانے سے ہی مختلف ملکوں سے رہے ہیں۔ مورخین اس بات کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں کہ موہن جودڑو اور ہڑپا کے عہد سے ہی ہندوستان کے تجارتی تعلقات یونان،

مصراور روم جیسے ملکوں سے تھے۔جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیاہندوستان کے تجارتی تعلقات ایران اور عرب سے بھی قائم ہوئے۔تاریخی سفرناموں میں عرب سیاحوں اور مورخین کے سفرناموں کوسب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔زمانہ قدیم سے ہی عرب سیاحوں نے تجارت اورتبلیغ مذہب کے خاطر ملکوں ملکوں کا سفر اختیار کیا۔تقریباً۶۰۰ ء میں عربوں نے ہندوستان سے بھی تعلقات استوار کیے۔اور متعدد عرب سیاح اور تاجر ہندوستان وارد ہوئے اور انہوں نے ہندوستان کے حالات وکوائف کواپنے سفرنامے میں پیش کیا ہے۔عرب زمانہ قدیم سے ہی تاریخ اور علم جغرافیہ میں مہارت رکھتے تھے۔لہٰذاانہوں نے اپنے سفرناموں میں ہندوستان کی تاریخی اور جغرافیائی حالات کومربوط انداز میں قلمبند کر دیا ہے، جس کی وجہ سےعربوں کےسفرنامے بنیادی اورتاریخی ماخذتسلیم کیے جاتے ہیں۔

عرب کا سب سے پہلا سیاح جو ہندوستان وارد ہوااس کا نام سلیمان تھا،جس نے ہندوستان کی سیر کی اور ۲۳۷ھ میں اپنا سفرنامہ تحریر کیا۔جسے ۱۸۴۵ءمیں ’’سلسلہ التواریخ‘‘ کے نام سے شائع کیا گیا۔وہ تجارت کے سلسلے میں عراق کی بندرگاہ سے چین اورمشرقِ اقصیٰ جایا کرتا تھا۔سلیمان کا ہندوچین کے دوران جن جن ساحلی علاقوں اور جزیروں سے گزرہوااس نے وہاں کے باشندوں، جانوروں اورلوگوں کے رسم ورواج کا تبصرہ اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔سلیمان نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں کا مشاہدہ کیااور ہندوستانی تہذیب ومعاشرت اور بادشاہوں کے حالات وغیرہ کا چینی تہذیب وثقافت سے موازنہ کیا ہے۔سلیمان نے اپنے سفرنامے میں ہندووں کے حالات اور ان کے طورطریقے، اخلاق وعادات اورمذہبی عقائد پرتفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

تیسری صدی ہجری کےسفرنامہ نگاروں میں ابوزیدحسن السیرافی کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، جوسیراف کا رہنے والا تھا۔سیرافی نے ہندوستان اور چین کے درمیان بحری اور تجارتی سفر کیا تھا۔ہندوستان سفر کرنے والے سیاحوں میں بزرگ بن شہریار بھی اہم سفرنامہ نگار ہیں،جنہوں نے چوتھی صدی ہجری میں ہندوستان کا سفر کیا۔بزرگ بن شہریار ایک جہازراں تھاجوچین وجاپان اور ہندوستان کے ساحلوں تک جہازرانی کرتے ہوئے ہندوستان وارد ہوا تھا۔انہوں نے اپنے تجربات اورمشاہدات کو’’عجائب الہند‘‘ کے نام سے مرقوم کیا ہے۔اس میں ہندوستان بالخصوص جنوبی ہنداور گجرات کے حالات کونہایت بےباک انداز میں بیان کیا ہے۔

عرب سیاح ابوالحسن سعودی کا نام اہم سفرنامہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ابوالحسن سعودی ایک نامور مورخ،جغرافیہ

نویس، تاجر اور سیاح تھا، جو بغداد سے سفر پر روانہ ہوا۔ ابوالحسن سعودی نے ۹۱۵ء میں ہندوستان کا سفر کیا۔ اس کی تالیف ''مروج الذہب'' میں ہندوستان کی مغربی ساحلی بستیوں، سند آباد اور ملتان کے بارے میں دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے پچیس سال سیاحت میں گزارے۔ ابوالحسن سعودی نے سفر کی شروعات اپنے آبائی وطن عراق سے کی اور وہاں سے شام، روم، ایشیاء کوچک، افریقہ، سوڈان، چین اور تبت ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوا۔ ابوالحسن سعودی نے بہت سی کتابیں تصنیف کی جس میں'' مروج الذہب'' اور ''معاون الجوابتہ'' بہت اہم ہیں، جو سفرناموں کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے سفرنامہ نگاروں میں ابواسحاق ابراہیم کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ مشہور جغرافیہ داں اور سیاح تھا۔ اس نے ایشیاء کے کئی ممالک کی سیاحت کی اور ۳۴۰ھ میں ہندوستان آیا۔ ابواسحاق کی جغرافیہ میں دو کتابیں ''الاقالیم'' اور ''المسالک والممالک'' شائع ہو چکی ہیں۔ اس نے پہلی کتاب میں مختلف شہروں بالخصوص سندھ کا جغرافیائی نقشہ کھینچا ہے اور دوسری کتاب میں عرب و ایران اور ہندوستان کا ذکر کیا ہے۔

محمد ابو باالقاسم ابن حوقل بھی چوتھی صدی ہجری کا سیاح تھا اور وہ بغداد کا تاجر تھا۔ محمد ابو بالقاسم نے ۳۳۱ھ میں بغداد سے سیاحت کے لیے نکلا اور ۳۵۸ھ میں واپس آیا۔ محمد ابو بالقاسم کی کتاب ''اشکال البلادیہ'' ۳۶۶ھ میں مرتب ہوئی۔ اس نے اسپین سے لے کر ہندوستان تک سیاحت کی ہے۔

بشاری مقدس بھی چوتھی صدی ہجری کا مشہور عرب سیاح تھا۔ بشاری مقدسی نے تمام اسلامی ممالک کی سیاحت کی اور وہ ہندوستان میں سندھ تک آیا تھا۔ بشاری مقدسی نے اپنا سفرنامہ ''احسن التقالیم فی معرفت الاقالیم'' کے نام سے ۳۷۵ھ میں قلمبند کیا۔

گیارہویں صدی عیسوی میں ایک ایسے سیاح کا نام آتا ہے جس کا ذکر کیے بغیر سفرنامہ نگاری کی روایت نامکمل رہے گی۔ عرب سیاحوں میں قابلِ ذکر سیاح ابوریحان البیرونی ہے۔ ابوریحان البیرونی خوارزم وسط ایشیا کا رہنے والا تھا، اس کا شمار اپنے وقت کے علماء و فضلاء میں ہوتا تھا۔ وہ فارسی، عربی، ایرانی اور سنسکرت کے علاوہ کئی بیرونی زبانوں کا ماہر تھا۔ طبیعات، منطق، ریاضی، علم الناظر، علم الآثار، ارضیات، علم کیمیا اور تاریخ کے علاوہ کئی علوم میں اسے دسترس حاصل تھی۔ البیرونی نے محمود غزنوی کے عہد (۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء) میں ہندوستان کا سفر کیا۔ البیرونی کی شہرۂ آفاق تصنیف

''کتاب الہند'' ہے، جس میں ہندوستان اور اس کے تہذیب وتمدن اور دیگر حالات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ سفرنامہ ''کتاب الہند'' کشمیریوں کی زندگی اور تمدن کے متعلق تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں مذہب، فلسفہ، ادب، موسم، جغرافیہ، ریاضی، جیوتش اور فلکیات وغیرہ شامل ہیں۔

دنیا کی سیاحت سے معرفتِ الہٰی حاصل کرنے والے عرب سیاحوں میں محمد ابن جبیر اندلسی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ابن جبیر اندلسی غرناطہ کا رہنے والا تھا۔ محمد ابن جبیر اندلسی کو تین مرتبہ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ ابن جبیر اندلسی نے پہلا سفر ۱۱۸۳ء میں اور دوسرا سفر ۱۱۸۹ء اور تیسرا سفر اپنی بیوی کی وفات کے بعد کی۔ ابن جبیر اندلسی کا سفرنامہ ''رحلۃ ابن جبیر'' عربی زبان کا شاہکار ہے۔ اس سفرنامے میں ابن جبیر اندلسی کے پہلے سفر کی روداد درج ہے۔ اس سفرنامے میں انہوں نے فریضہ حج کے علاوہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت بھی کی جس میں اسکندریہ، قاہرہ، جدہ، مکہ، مدینہ، کوفہ، بغداد، موصل، حمص اور دمشق جیسے شہروں کا تبصرہ کیا ہے۔ اس سفرنامے کا ترجمہ حافظ احمد علی خاں شوق نے کیا، جو مطبع رامپور سے شائع ہوا۔ سفرنامے کے ترجمے پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ سفرنامہ تاریخی سفرناموں میں کافی اہمیت کا حامل ہیں۔

عرب سیاحوں میں ابن بطوطہ کسی قدر مختلف ہے۔ ابن بطوطہ کے ذکر کے بغیر سفرنامے کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کی شہرت کا راز سیر و سیاحت ہے۔ ابن بطوطہ چودھویں صدی عیسوی کا وہ سیاح ہے، جس نے دشوار گزار راستوں کے باوجود اس وقت کے کئی مسلم ممالک کا سفر کیا۔ ابن بطوطہ ۱۳۲۵ء (۷۲۵ھ) میں حج کے ارادے سے اپنے وطن سے رخصت ہوا اور تقریباً تیس سال بعد ۷۲۵ھ میں ہندوستان اور چین کا سفر کر کے واپس اپنے وطن لوٹا۔ ابن بطوطہ مصر، شام اور دمشق ہوتا ہوا ۷۲۶ھ میں مدینہ منورہ پہنچا اور حج کے فرائض ادا کرنے کے بعد بغداد گیا۔ ابن بطوطہ عراق کے مختلف شہروں کو گھومنے کے بعد ۷۲۸ھ میں دوبارہ حج کیا اور پھر ایشیا کے مختلف شہروں میں گھومتا ہوا سندھ پہنچا اور سندھ سے ملتان، اجودھن (پاک پٹن)، ابوہر، سرسہ اور ہانسی ہوتا ہوا دہلی پہنچا۔ دراصل ابن بطوطہ نے دنیا کے متعدد ممالک کا دورہ کیا اور جہاں گردی کرتے ہوئے وہ محمد بن تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا اور کافی عرصہ یہاں قیام کیا۔ ابن بطوطہ کو محمد بن تغلق نے عہدۂ قضاء پر فائز کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے سفرنامے میں ہندوستان کے شرفا و امرا کے حالات، تہذیب وثقافت، نشست و برخاستگی کے آداب، مہمان نوازی اور انصاف پروری کے بارے میں تمام معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان میں ابن بطوطہ نے (۷۳۴ھ تا ۷۴۳ھ) کے درمیان نو سال تک قیام کیا۔ابن بطوطہ نے ۷۲۵ ھ تا ۷۵۰ھ میں حجاز مقدس، مصر، شام، عراق، ایران، ہندوستان، مالدیپ اور چین وغیرہ کی سیاحت کی۔اور انہوں نے ۷۵۱ھ تا ۷۵۴ھ میں سوڈان اور اس کے اطراف میں سیر کی۔ابن بطوطہ نے اپنی عمر کے تقریباً ۲۸/سال مختلف مقامات کے سیاحت میں گزارے اور سفر میں پیش آنے والے واقعات، مشاہدات ومعلومات کو اپنے سفر نامے ''عجائب الاسفار'' میں قلم بند کیا ہے۔ان کو اپنے سفر کے دوران تین مرتبہ حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں مکہ معظّمہ، مدینہ منوّرہ اور مسجد نبویؐ کے مختلف حالات وواقعات کو بھی قلمبند کیا ہے۔

ابن بطوطہ کے سفر نامے کی دریافت کا سہرا شموئل احمد کے سر ہے، انہوں نے اس سفر نامے کی تلخیص ۱۸۲۹ء میں شائع کی۔سفر نامہ ''عجائب الاسفار'' کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں ملتا ہے۔پہلی جلد (۱۳۴۸ھ) میں مولانا عطاء الرحمٰن نے رحمانی پریس، دہلی سے طبع کروایا اور دوسری جلد ۱۸۹۸ء میں مولوی سید ممتاز علی نے مطبع رفاہِ عام، لاہور سے چھپوایا۔اس سفر نامے کا ترجمہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مطابق سید حیات الحسن رضوی نے کیا ہے، جو ۱۹۰۱ء میں امرتسر سے شائع کیا۔اس سفر نامے کا ایک مکمل ترجمہ رئیس احمد جعفری نے کیا ہے، جو ۱۹۶۱ء میں نفیس اکیڈمی، کراچی سے شائع کیا۔مولوی محمد حسین نے ''عجائب الاسفار المعروف سفر نامہ ابن بطوطہ'' عاکف بکڈپو، دہلی اشاعت ششم ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔

ہندوستان کی کشش ہر دور میں دنیا کے لئے برقرار رہی ہے اور مختلف ملکوں سے سیاح ہندوستان آتے رہے اور ہندوستان کے سفر کی سنہری یادیں اپنے سفر ناموں میں قلم بند کرتے رہے۔ہندوستان میں عرب سیاحوں کے ساتھ ساتھ کئی ایرانی سیاح بھی آئے۔ذیل میں چند ایرانی سیاحوں کے سفر ناموں کا احاطہ کیا جارہا ہے، جنہوں نے مختلف ادوار میں ہندوستان کی سیاحت کی اور اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔

ایرانی سیاحوں میں حکیم ناصر خسرو بلخی پہلا سیاح ہے جو ہندوستان آیا۔ناصر خسرو کا وطن خراسان کا شہر بلخ تھا وہ ایک بڑا عالم، فلسفی، شاعر اور بہت سی کتابوں کا خالق تھا۔۱۰۴۵ء میں حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے غرض سے اپنے سفر کی شروعات کی اور وہ ۱۰۵۲ء تک مسلسل سفر کرتا رہا اور اپنے اس سفر میں اس نے چار حج کیے۔ناصر خسرو نے اپنے سات سالہ سفر کے دوران خراسان، قزوین، طبرستان، تبریز، حلب، طرابلس، بیروت، حیفا، رملہ، بیت المقدس،

قاہرہ، اصفہان اور مکہ معظّمہ و مدینہ منوّرہ کا سفر کیا۔حکیم ناصر خسرو کے سفرناموں میں ''سفرنامہ سیاحت'' اور ''زادالمسافرین'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔اس سفرنامے کا اردو ترجمہ مولوی عبدالرزاق کانپوری نے ۱۹۴۱ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے شائع کیا۔ناصر خسرو کے سفرنامے فارسی سفرناموں میں بہت قدیم ہیں اور وہ اپنے مضامین اور فنی محاسن کے لحاظ سے بے حد اہم شمار کیے جاتے ہیں۔

ناصر خسرو کے بعد کئی ایرانی سیاح ہندوستان آئے اور انہوں نے اپنے سفر کی روداد کو فارسی میں تحریر کیا ہے۔ جن میں شیروانی مست علی شاہ کا سفرنامہ ''بسان السیاحہ'' بھی اہم ہے۔ڈاکٹر وفا یزدان کے مطابق:

> ''شیروانی نے ۱۲۱۶ھ میں ہندوستان کا سفر کیا تھا۔اپنے اس سفر میں انہوں نے پنجاب ،دہلی ،فیض آباد، بنگال، گجرات۔ملتان اور کشمیر کا جائزہ لیا اور مختلف دینی فرقوں سے متعلق تفصیلات جمع کر دی۔انہوں نے اپنے مشاہدات و تاثرات کو ''بستان السیاحہ'' کی شکل میں ۱۲۴۸ھ میں تحریر کر کے ۱۳۱۰ھ کو تہران میں چھپوایا۔بستان السیاحہ ادب میں ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے۔'' (۱۰)

فارسی میں تحریر کردہ سفرناموں میں فقید شوشتری کا سفرنامہ ''تحفۃ العالم'' تاریخ جغرافیہ، فارسی ادب ،موسمیات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے دیگر سیاسی و معاشرتی جزئیات نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔یہ کتاب ۱۲۱۶ھ میں مکمل ہوئی۔اس سفرنامے میں ہندوستان کے مختلف شہروں اور حیدرآباد کے نظام کے حالات وغیرہ درج ہیں۔ ہندوستان میں سفرنامے کی ابتداء بھی اردو کی دیگر اصناف کی طرح فارسی کے زیر اثر ہوئی۔

ہندوستانی سیاحوں کے ذریعے تحریر کردہ سفرناموں میں ''سفرنامہ فرنگ'' المعروف بہ ''میسر طالبی فی بلاد افرنجی'' جو مرزا ابوطالب اصفہانی کا سفرنامہ ہے۔اس کے علاوہ اعتصام الدین بنگالی کا سفرنامہ ''شگرف نامۂ ولایت'' بھی فارسی کا اہم سفرنامہ ہے،جس نے ہندوستان میں اردو سفرناموں کی روایت کو فروغ دینے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

ہندوستان قدیم زمانے سے ہی عراق ،مصر، یونان کی طرح تہذیب وثقافت کا اہم مرکز تھا،جس کی وجہ سے ہر دور میں سیاحوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ ہندوستان اپنے مذاہب ،تہذیب وتمدن اور زرعی ومعاشی ذرخیزی کی وجہ سے تمام عالم میں اتنا مشہور ومقبول تھا کہ ہر گوشہ سے سیاح آنے کی خواہش رکھتے تھے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں

ہندوستان کی شہرت یورپ تک جا پہنچی۔ یورپی سیاحوں نے ہندوستان کے سمندری راستے کی تلاش کی۔ پرتگالی سیاح واسکوڈ گاما ہندوستان کو تلاش کرتے ہوئے مالا بار کے ساحل پر آ پہنچا اور یہاں سے باضابطہ ہندوستان اور مغربی ممالک کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا۔ اس طرح مغربی سیاح ہندوستان آنے لگے اور اس ملک کی دولت و زرخیزی کے قصے اپنے ملکوں میں جا جا کر بیان کرنے لگے۔

ابن بطوطہ کی طرح سفر میں اپنی زندگی صرف کرنے والا سیاح مارکو پولو کا بھی سفرنامے کی تاریخ میں ایک اہم نام ہے۔ تیرہویں صدی میں سیاحت پر نکلنے والا سیاح مارکو پولو وینس کا رہنے والا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے چالیس سال سفر میں گزارے۔ ان کے والد نکو پولو وینس اپنے عہد کا ایک عظیم سیاح تھا، جس کا تعلق کیتھے (Cathy) کے قبیلائی خاندان کے دربار سے بھی رہ چکا تھا، جو اتفاقاً بخارا کے راستے وہاں پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید مارکو پولو کی وجوہات کا جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مارکو پولو اپنے باپ سے مشرق کے چمکتے کلسوں اور بلند میناروں والے شہروں کی کہانیاں سنیں تو اس کا ذوقِ سیاحت جاگ اٹھا اور وہ اپنے باپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہو گیا۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں مارکو پولو مالا بار کے راستے ہندوستان میں وارد ہوا اور (۱۲۵۵ء تا ۱۲۶۷ء) تک اس ملک میں مقیم رہا۔ مارکو پولو کا سفر طویل المیعاد تھا اور اس نے مشاہدات کو ایک مضبوط سفرنامے کی صورت میں بھی قلمبند کیا۔ مارکو پولو مہم جوئی کی علامت ہے اور یہ انسان کے جذبہ تجسس کو روبہ عمل لانے اور اس کی تسکین کے لئے نئی زمینوں کا سفر اختیار کرنے کی مثال ہے۔ اس کا سفرنامہ متنوع تجربات کی ایک وسیع کائنات ہے۔'' (۱۱)

مارکو پولو کا سفر دلچسپ اور معلومات سے پُر ہے۔ اس سفرنامے کا ترجمہ انگریزی سے دیگر زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ مارکو پولو نے کشمیر کی بھی سیر کی اور اپنے سفرنامے میں کشمیر کو ''کیشی میر'' (Keshmir) کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ اس سفرنامے میں حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ سفرنامہ دنیا کی بہترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مارکو پولو کے بعد ہندوستان میں وارد ہونے والا دوسرا یوروپی سیاح بارتھولو (موڈاز) ہے، جس نے ۱۴۸۶ء

میں پرتگالی بادشاہ کے حکم پر لزبن سے ہندوستان کا بحری سفر کیا۔ بحری سفر کے دوران سمندری طوفان نے اس کے سفر میں رکاوٹ کھڑی کر دی اور وہ اپنے ملک واپس لوٹ گیا۔ ۱۴۹۲ء میں اسپین کے بادشاہ نے اس مہم میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کرسٹوفر کولمبس کو روانہ کیا۔ کولمبس نے غلطی سے جنوب کے بجائے مغرب کا رخ اختیار کر لیا اور وہ امریکہ پہنچ گیا۔ تیسری مرتبہ پرتگال کے بادشاہ کے حکم پر واسکوڈی گاما نے ہندوستان کی طرف سفر کیا اور وہ ۲۸ رمئی ۱۴۹۸ء کو مالا بار ساحل پر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

پندرہویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی عالمی تجارت میں یورپ عرب سے آگے بڑھ گیا تھا۔ چینی اور عرب سیاحوں کے علاوہ بہت سے فرانسیسی سیاحوں نے بھی ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ ان فرانسیسی سیاحوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر برنیر کا ہے، جو شاہ جہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ مغربی سیاحوں میں ڈاکٹر برنیر اہمیت کا حامل ہیں۔ ڈاکٹر برنیر کا سفر نامہ ''وقائع سیاحت برنیر'' کے نام سے بہت مقبول ہوا۔ برنیر ۱۶۴۵ء میں مصر و شام کی سیاحت میں نکلا اور سفر کرتے کرتے ہندوستان پہنچ گیا۔ ۱۶۵۶ء تا ۱۶۶۸ء کے درمیان ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ اس سفر نامے کا ترجمہ کرنل ہنری مور نے خلیفہ محمد حسن کی مدد سے اردو میں کیا۔ برنیر اپنے سفر نامہ میں دہلی کا حصار ''شہر پناہ'' دہلی کے بازار، رہائشی مکان، دوکانیں، بازار میں فروخت ہونے والی اشیاء، مچھلی، پرندے اور بادۂ فرنگ وغیرہ کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔

یوروپی سیاحوں میں برنیر کے ہم عصر ٹیونیر بھی اہم ہے۔ اس کا پورا نام Jean Paptisto Tavernier تھا۔ ٹیونیر کے سفر کا زمانہ (۱۶۴۱ء تا ۱۶۶۷ء) کے قریب ہے۔ ٹیونیر جواہرات کا تاجر تھا۔ اس نے اپنی تجارت کی وجہ سے ہندوستان کے کئی بڑے شہروں اور درباروں تک رسائی حاصل کی۔

ڈاکٹر خالد محمود کے مطابق مغل دور کے سیاسی سفر نامہ نگاروں میں سب سے زیادہ متنازع فیہ شخصیت نکولائی مانوچی کی ہے۔ مانوچی ایک اطالوی سیاح ہے، جو اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ Niccoloo Mannuchi نے (۱۶۵۳ء تا ۱۷۰۸ء) تک ہندوستان میں قیام کیا۔ مانوچی نے اورنگ زیب کے عہد کے مذہبی، تہذیبی اور تاریخی احوال کو افسانوی انداز میں پیش کیا ہے۔ مانوچی کی سیاحت کا علاقہ مغل سلطنت بیجا پور، گولکنڈہ اور عادل شاہی سلطنت تک پھیلا ہوا تھا۔

ہندوستان وارد ہونے والے سیاحوں میں موسیوتھیونو کا سفرنامہ بھی قابلِ ذکر ہے، کیونکہ وہ نہ تو تاجر تھا نہ کسی بادشاہ کا سفیر اور نہ ہی کسی کمپنی کا ملازم۔ موسیوتھیونو ایک فرانسیسی سیاح تھا، جو ۱۶۶۵ء کو اپنے ملک سے سفر ہندوستان کے لیے روانہ ہوا اور ۱۰/جنوری ۱۶۶۶ء میں سورت کی بندرگاہ پر اترا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی برسوں تک کئی ممالک کی سیر کر چکا تھا جس میں جزائر سسلی، مالٹا، ترکی اور مشرقِ وسطیٰ شامل ہے۔ موسیوتھیونو کا سفرنامہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ روم اور مصر سے متعلق ہے، دوسرا ایران اور تیسرے حصے میں ہندوستان کا ذکر ہے۔ اس سفرنامے کا پہلا حصہ اس نے خود اپنی زندگی میں شائع کروایا جبکہ اور دو حصے اس کی حیات میں شائع نہیں ہو سکے۔ موسیوتھیونو کے سفرنامے کے تینوں حصے ۱۶۸۷ء میں فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ ہوئے۔ مسٹر اے لیول کے اس ترجمہ سے سید علی بلگرامی نے دکن سے متعلق سفرنامہ ''سفرنامۂ دکن'' کا ترجمہ کیا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں ہر چیز کا ذکر کیا ہے جس میں جغرافیائی حالات، آمدنی کے ذرائع، نوکروں وخادموں کے اقسام، جنگلی جانور، پالتو جانور، زمین، زراعت فصل، مسجدوں، مندروں، درباروں، نیز بادشاہوں اور امرا کے تمام حالات بڑی خوبی سے قلم بند کیا ہے۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں دکن بالخصوص دولت آباد، بیدر اور گولکنڈہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس طرح موسیوتھیونو کے سفرنامہ دکن بڑا دلچسپ اور معلوماتی ہے، جس سے سترہویں صدی کی ہندوستان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں سفیروں، تاجروں، اور سیاحوں کے سیاحت ناموں سے متاثر ہو کر عیسائی مشنریوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور یہ سلسلہ آزادی تک جاری رہا۔ انہوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کے لیے ہندوستان کی سرزمین کو سازگار پایا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مشنریز قائم کئے۔ تقریباً ۱۷۱۴ء میں پرتگیزی مشنری ڈی سدری عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ہندوستان آیا۔ اس نے کشمیر میں چھ ماہ قیام کیا۔ پادری کشمیر پہنچتے ہی دست کی بیماری کا شکار ہو گیا اس لیے وہ مسیحیت کی تبلیغ نہیں کر سکا۔ جارج فاسٹر نامی سیاح ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم ہوا اور ۱۷۸۶ء میں وہ کشمیر کی سیاحت پر نکلا۔ سیاحت کا سوقین جارج فاسٹر کشمیر اور کابل سے ہو کر بحیرہ کیسپین کو عبور کر کے سینٹ پیٹرز برگ کے راستے انگلستان پہنچنا چاہتا تھا۔ جارج فاسٹر نے یہ سارا سفر بھیس بدل کر کیا تھا کیونکہ ملک میں حالات سازگار نہیں تھے اور وہ ایک سفید فارم یوروپی تھا۔ اس کے سفر کی ان تلخ وشیریں یادوں پر مبنی سفرنامہ ۱۷۹۰ء میں شائع ہوا۔ جارج فاسٹر کے سفرنامے کی دوسری جلد اس کی وفات کے بعد اس کے کاغذات سے برآمد ہوئی، جو ۱۷۹۸ء

میں شائع ہوئی۔

سفر کرنے اور سفر نامہ تحریر کرنے میں مرد سیاحوں کے ساتھ ساتھ یوروپی خواتین نے بھی حصہ لیا ہے جن میں ماریہ گراہم (Maria Graham)، این کیتھرئن (Anne kathreian) اور مارئن پاسٹن (Marianne Postan) کے نام بھی شامل ہیں۔ ماریہ گراہم بعد میں Lady Callcott کے نام سے جانی گئیں۔ انھوں نے ۱۸۰۹ء میں اپنے والد کے ساتھ ہندوستان کا سفر کیا اور یہیں پر ان کی شادی ہوئی۔ بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے ساحلی علاقوں میں دو سال گزارنے کے بعد وہ ۱۸۱۱ء کو انگلینڈ روانہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی دو سالہ یادگار کو ۱۸۱۲ء میں Journal of Residence in India کے نام سے کتاب لکھی۔

Anne kathreian Elwood ۱۸۲۵ء میں اپنے شوہر Elwood کے ساتھ ہندوستان آئی تھیں۔ وہ پہلی خاتون سیاح تھیں جو مصر اور بحر احمر کا سفر کرتے ہوئے ہندوستان آئیں تھیں۔ ان کے سفر کی یاداشت دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ ان کی کتاب کا نام Memories of the Literary of England from the Commencement of the last Century ہے، جو ۱۸۴۳ء میں شائع ہوئی۔

Marianne Postan کی تصنیف Western India اور The Moslem Noble ہندوستان کے شاہی گھرانوں کے احوال پر مبنی ہے، جس میں ہندوستان کے حالات اور حقیقت کو افسانوی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی مشہور کتاب Western India ۱۸۳۸ء میں شائع ہوئی۔ انہوں نے ایک اور کتاب The Moslem Noble کے نام سے لکھی، جو ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی۔ ان تینوں خواتین نے اپنی تصانیف یا سفر کی یادگار میں مشرقیت پر تفصیل سے لکھا ہے، جس کے مطالعہ سے مشرقی لوگوں کے بارے میں یورپی خواتین کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس طرح سفر نامے لکھنے کی شروعات ہوئی اور اس فن کو ترقی حاصل ہوتی گئی۔ اور مختلف ملکوں میں مختلف زبانوں میں سفر نامے تحریر کرنے کا رواج عام ہوا۔ جن سیاحوں نے سیر و سیاحت کے مشاہدات اپنے سفر ناموں میں بیان کیے وہ اپنے سفر نامے کے حوالے سے امر ہو گئے اور انہوں نے اپنے عہد کو بھی زندہ جاوید کر دیا ہے۔ آج یہ سفر نامے ہمارے تہذیبی میراث کے انمول سرمایہ ہے۔ یہ تاریخی سفر نامے نہ صرف قدامت کے لحاظ سے اہم ہیں بلکہ فنی

لحاظ سے بھی اہم ہیں۔

اردو سفرناموں کی روایت عربی، فارسی، انگریزی اور دنیا کی دیگر زبانون میں موجود سفرناموں کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ جیسے جیسے ہندوستانی یورپی ممالک جانے لگے اور وہاں کی صنعتی ترقی، معاشی خوشحالی اور آزادی سے متاثر ہوئے تو انہوں نے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرنے کے لیے سفرنامے تخلیق کرنا شروع کیا۔اس طرح اردو زبان میں سفرناموں کی توانا روایت کی بنیاد پڑی، جس نے آگے چل کر ایک بلند عمارت کی شکل اختیار کر لی۔

جب ہم اردو زبان کے آغاز اور اس کے ابتدائی دور کے خدوخال کا احاطہ کرتے ہیں تو تقریباً گیارہویں صدی عیسوی تک ماضی کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ایسا مانا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کا آغاز گیارہویں صدی عیسوی یا اس سے پہلے ہوا۔اردو ادب کی تاریخی کتابوں میں ہمیں جس قدیم ہندوی شاعر کا نام ملتا ہے، وہ گیارہویں صدی کا شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری ہے۔وہ غزنوی دور کا شاعر تھا اور اس کا زمانہ حیات ۱۰۴۸ء تا ۱۱۲۱ء ہے۔محمد عوفی نے ''لباب الالباب'' میں مسعود سعد سلمان کے عربی، فارسی اور ہندوی زبان کا تذکرہ کیا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں اردو نثری ادب کی مقبولیت کا باضابطہ آغاز فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ہوا۔ اردو نثر کی مختلف اصناف کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔فورٹ ولیم کالج کے تحت عربی اور فارسی کی قدیم نثری تصانیف کا عام فہم اردو زبان میں ترجمہ کیا جاتا تھا تا کہ نو وارد انگریز افسران ان تصانیف سے استفادہ کر سکیں۔اس طرح فارسی اور عربی کی اہم تصانیف کا اردو میں نہ صرف ترجمہ کیا جانے لگا بلکہ فارسی زبان و ادب کی اردو تراجم میں پیروی کی جانے لگی۔دراصل اردو کی کئی شعری اور نثری اصناف کی بنیاد فارسی زبان و ادب پر قائم ہے۔مغلیہ حکومت کی درباری زبان فارسی تھی، اس لیے اس عہد کی تمام اہم تصانیف اور درباری کام فارسی زبان میں تحریر کیے جاتے تھے۔جیسے جیسے اردو کا چلن عام ہوا ہندوستانی شعرا و ادبا نے فارسی زبان کو ترک کرتے ہوئے اردو زبان کو اختیار کیا لیکن ان کی تحریروں میں فارسی زبان کی جھلک آج بھی دکھائی دیتی ہے۔

عہد قدیم، عہد وسطیٰ اور عہد جدید غرض کہ ہر دور میں ہندوستان کے تعلقات بیرونی ممالک سے برابر قائم رہے۔یورپ سے ہندوستان کے تعلقات کو سولہویں اور سترہویں صدی میں زیادہ فروغ حاصل ہوا۔یورپ کی مختلف قومیں اور تجارتی کمپنیاں سمندری راستے کی دریافت کے بعد مسلسل ہندوستان آنے لگیں۔برطانیہ کے ایک تجارتی

ادارے ایسٹ انڈیا کمپنی نے آہستہ آہستہ ہندوستان میں قدم جمانے شروع کیے اور بالآخر ۱۷۵۹ء کی جنگ پلاسی کے بعد اس کمپنی نے مشرقی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر لی۔اس دور میں کئی یورپی سیاح ہندوستان آئے اور ہندوستان کے احوال کو اپنے سفر نامے میں قلمبند کرنے لگے۔اسی طرح ایک اہم تبدیلی یہ بھی ہوئی کہ ہندوستان کے کئی سیاح یورپ جانے لگے اور یورپ کی عجیب وغریب دنیا کا احوال اپنے سفر ناموں میں قلم بند کرنے لگے۔ہندوستان کے لیے یورپ کی سرزمین،ان کی سائنسی ترقی وایجادات اور آزادی نسواں کا تصور بالکل نیا تھا اور جب ہندوستانی ان احوال کو پڑھنے لگے تو یورپی سفر ناموں کے مطالعہ سے یورپ کے سفر کے شوق میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

ہندوستانی سیاحوں کے تحریر کردہ سفر نامے ابتداء میں فارسی زبان میں ہی تحریر کیے گئے۔جیسے جیسے اردو زبان کے لیے ماحول سازگار رہوا،ہندوستانی سیاحوں نے اردو زبان میں سفر نامے قلم بند کرنا شروع کیے۔ذیل میں چند سیاحوں اوران کے سفر ناموں کا احاطہ کیا جارہا ہے تاکہ عالمی پس منظر میں دنیا کے چند اہم سفر ناموں کی روایت کا جائزہ لیا جا سکے۔

شگرف نامہ ولایت (منشی اعتصام الدین):

''شگرف نامہ ولایت''انگلستان کے بارے میں پہلا ہندوستانی سفر نامہ ہے۔منشی اعتصام الدین پہلے ہندوستانی سیاح تھے،جنہوں نے انگلستان کا سفر کیا۔منشی اعتصام الدین مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے سفیر کیپٹن سوینٹن (Captain Swinton) کے ساتھ رفیق اور منشی کی حیثیت سے ۱۷۶۷ء میں لندن گئے اور ۱۷۶۹ء میں کلکتہ واپس ہوئے۔دورانِ سفر انہوں نے مختلف واقعات اور تجربات کو لکھا،اسی کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنا سفر نامہ ۱۷۸۵ء میں مرتب کیا۔اس سفر نامے کا نام''شگرف نامہ ولایت''رکھا گیا،جس کی زبان فارسی تھی۔اس سفر نامے کے کئی نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔اس کا ایک اہم نسخہ خدا بخش لائبریری،پٹنہ میں محفوظ ہے۔اس سفر نامے کا ترجمہ امیر حسن نورانی نے صاف وسلیس اردو زبان میں کیا ہے،جسے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ سے شائع کیا گیا۔سفر نامے کے آغاز میں منشی اعتصام الدین نے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں یورپ کے مختلف ممالک کے تاجروں اور سیاحوں کی آمد کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے کلکتہ سے جہاز پر سوار ہونے سے لیکر لندن تک پہنچنے،اور دورانِ سفر کی تمام تفصیلات کو اپنے سفر نامے میں قلم بند کیا ہے۔

مسیر طالبی فی بلاد افرنجی (مرزا ابوطالب خاں اصفہانی):

ہندوستان سے یورپی ممالک کی سیر پر جانے والے سیاحوں میں قباد بیگ، نواب کریم خان، میر محمد حسین اور اعتصام الدین وغیرہ شامل ہیں۔مگر مرزا ابوطالب خاں اصفہانی کا سفرنامہ ''مسیر طالبی فی بلاد افرنجی'' کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ابوطالب اصفہانی کا سفرنامہ انیسویں صدی کے بہترین سفرناموں میں شمار ہوتا ہے۔اس سفرنامہ کو یورپ میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اصل سفرنامہ جو کہ فارسی میں تحریر کیا گیا ہے، اس کی اشاعت سے قبل انگریزی زبان میں اس سفرنامے کا ترجمہ شائع ہوا۔اور اس سفرنامے کا خلاصہ ۱۸۱۱ء میں فرانسیسی اور ۱۸۱۴ء میں جرمن زبان میں شائع ہوا۔اس سفرنامے کی طباعت کا انتظام مرزا ابوطالب کے لڑکے مرزا حسن علی نے کیا، جو کہ فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ڈاکٹر ولسن کی مدد سے یہ سفرنامہ ۱۸۱۲ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے کی خوبیوں اور سن اشاعت کے بارے میں معلومات پہنچاتے ہوئے ڈاکٹر خالد محمود رقم طراز ہیں:

> ''فارسی کا ایک اور اہم سفرنامہ 'میر طالبی فی بلاد افرنجی' ہے۔اس کے مصنف مرزا ابوطالب خاں اصفہانی ۱۷۹۹ء میں لندن پہنچے اور ۱۸۰۳ء میں ہندوستان واپس آئے۔'میر طالبی' میں ان کے سفری مشاہدات اور تاثرات کی بڑی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔قیام لندن کے دوران مرزا ابوطالب نے انگریزوں کی تہذیب و تمدن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور بڑی محنت سے احوال و کوائف جمع کئے۔یہ سفرنامہ انگریزی تہذیب کے تمام نقوش ابھارتا ہے اور انگریزوں کی معاشرت کے خصائص و معائب کا بڑی بے باکی سے اظہار کرتا ہے۔ہندوستان کے ابتدائی سفرناموں میں 'میر طالبی' کی بڑی اہمیت ہے۔یہ سفرنامہ ۱۸۰۶ء میں رقم ہوا اور ۱۸۱۰ء میں چارلس ایسٹوارڈ نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا۔اور اس کے اصلی نسخے کو فورٹ ولیم کالج نے ۱۸۱۲ء میں ٹائپ کی شکل میں شائع کیا۔'' (۱۲)

اس سفرنامے کا ترجمہ اردو میں مرزا علی محزوں مراد آبادی نے حواشی، تصاویر اور نقشہ جات کے اضافے کے ساتھ کیا ہے۔''میر طالبی'' کا ایک اور اردو ترجمہ ڈاکٹر ثروت علی نے ''سفرنامہ فرنگ'' کے عنوان سے کیا ہے، جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔مرزا ابوطالب اصفہانی نے اپنے سفرنامے میں

انگلستان کی جغرافیائی حالات، حیوانات، چرند و پرند کا ذکر، قہوہ خانے، کلب، تماشا گاہیں، ناچ گھر، بینک، پل، نہروں اور صنعت وحرفت کی تمام تفصیل کو پیش کیا ہے۔

مذکورہ سفرنامے فارسی زبان میں تحریر کیے گئے۔ اردو سفرناموں کے لیے فارسی سفرنامے کی روایت نے راستہ ہموار کیا۔ اردو کے دیگر اصناف کی طرح سفرنامے بھی فارسی کے زیر اثر ہی تحریر کیے گئے۔ جس کی واضح جھلک ہمیں اردو کے ابتدائی دور کے سفرناموں میں دکھائی دیتی ہے۔ جب ہم اردو سفرناموں کے ابتدائی نقوش کا جائزہ لیتے ہیں تو ہماری نظر ''شگرف نامہ'' اور ''میر طالبی'' پر آ کر ٹھہرتی ہے۔

اردو کا پہلا سفرنامہ کون سا ہے، اور اردو زبان کا پہلا سفرنامہ نگار کون ہے، اس کے بارے میں بہت سے ناقدین کی عمومی رائے ہے کہ ''تاریخ یوسفی'' المعروف بہ ''عجائبات فرنگ'' اردو کا پہلا باضابطہ سفرنامہ ہے۔ اردو کا پہلا سفرنامہ کون سا ہے اس کی تصدیق کرنے کے لیے اور اختلاف آراء کے تضاد کو ختم کرنے کے لیے مختلف ناقدین اور محققین کی آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بارے میں فیصلہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اردو کے پہلے سفرنامے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''اردو سفرناموں میں اب تک یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائبات فرنگ''
> قدیم ترین شمار ہوتا ہے۔'' (۱۳)

تحسین فراقی اپنی مرتبہ کتاب ''مقدمہ عجائبات فرنگ'' میں اردو کے پہلے سفرنامہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''کمبل پوش کی تاریخ یوسفی ''عجائبات فرنگ'' اردو کا پہلا سفرنامہ ہی نہیں بلکہ سفرنامے
> کا اہم ترین سنگ میل بھی ہے اور اس پر جدید سفرنامے کی اصطلاح کا اطلاق بھی حد
> تک ہوتا ہے۔'' (۱۴)

ڈاکٹر مظہر احمد اپنی تصنیف ''مقدمہ: تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ: تحقیق وتدوین'' میں اردو کے پہلے سفرنامے کے بارے میں اپنا خیال اس طرح پیش کرتے ہیں:

> ''اردو میں سفرناموں کا نقش اوّل ''تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ'' از یوسف
> خاں کمبل پوش ہے۔'' (۱۵)

ڈاکٹر خالد محمود اپنی تصنیف ''اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ'' میں اردو سفرنامے کی اولیت کے بارے میں رقم

طراز ہیں:

''تا حال دریافت شدہ اردو سفرناموں کی طویل فہرست میں یوسف خاں کمبل پوش کا ''تاریخ یوسفی'' معروف بہ ''عجائبات فرنگ'' اردو کا اولین سفرنامہ قرار پاتا ہے۔'' (۱۶)

ڈاکٹر محمد شہاب الدین اردو کے پہلے سفرنامے کے بارے میں اپنی تصنیف ''اردو میں حج کے سفرنامے'' میں تحریر کرتے ہیں:

''اردو میں سفرنامہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ ۱۸۴۷ء میں یوسف خاں کمبل پوش حیدرآبادی کا لکھا ہوا اردو کا اولین سفرنامہ ''تاریخ یوسفی'' مطبع العلوم دہلی کالج سے شائع ہوکر منظرِ عام پر آیا۔'' (۱۷)

اب تک سفرنامے کی روایت کے بارے میں اردو سفرنامے کے فن پر کام کرنے والے محققین کی آراء کو پیش کیا گیا ہے۔ ذیل میں تاریخ اردو کی چند تصانیف کا حوالہ دیا جارہا ہے تاکہ اردو سفرنامے کی اولیت کے تعین میں آسانی ہو سکے۔ احسن مارہروی اپنی تصنیف ''اردو نثر کی تاریخ'' میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ احسن مارہروی اپنی تصنیف ''نمونہ منشورات'' میں تاریخ یوسفی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ سفرنامہ پنڈت دھرم نرائن کے اہتمام سے مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں چھپا ہے جس کا سن طباعت ۱۸۴۷ء ہے۔ کتاب کا حجم (۲۹۷) صفحہ ہے، اور اکثر صحت کتابت کا خیال رکھا گیا ہے۔ مگر املا میں یائے معروف و مجہول کا ایک قلم لحاظ نہیں کیا گیا۔ زبان عام فہم ہے۔ البتہ پرانی ترکیبیں جابجا موجود ہیں۔ جن پر انتقالِ ذہنی اور توجہ نظر کے لئے لکیریں (۔) کھینچ دی ہیں''۔ (۱۸)

حامد حسن قادری اپنی تصنیف ''داستان تاریخ ادب اردو'' میں پہلے سفرنامے کی تصدیق کے بارے میں اپنی معلومات اس طرح پیش کرتے ہیں:

''یوسف کمبل پوش: حیدرآباد وطن اصلی تھا، سیر و سیاحت کے لئے گھر سے نکلے، تمام ہندوستان کی سیر کر کے انگلستان کا سفر کیا، یورپ کے دوسرے مقامات اور مصر وغیرہ کی بھی سیر کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہندوستانی سیاحوں میں سب سے قدیم

تھے۔ ۱۸۲۸ء سے سیاحت شروع کی ، ۱۸۳۷ء میں ولایت کا سفر کیا۔ حالاتِ سفر لکھتے گئے، جن کو ۱۸۴۷ء میں دہلی سے چھپوایا۔ پھر دوبارہ ۱۸۷۲ء میں مطبع نول کشور میں چھپا۔ عجائبات فرنگ اس کا نام ہے۔ یہ اردو میں سب سے پہلا سفر نامہ ہے۔ اور بڑی خوبی یہ کہ محض ایک سیاح کا سفر نامہ ہے، جس کی کوئی قومی و ملکی یا تعلیمی غرض نہ تھی۔'' (۱۹)

اردو سفر نامے کی اولیت کے بارے میں اب تک جن محققین اور مورخین کی ادب کے آراء کو پیش کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یوسف خاں کمبل پوش کے سفر نامے ''تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ'' کو اردو سفر ناموں کی روایت میں فوقیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اردو میں سفر نامہ نگاری کی تاریخ رقم کرنے والے محقق مرزا حامد بیگ اس سے قدر مختلف ہیں۔ وہ اپنی تصنیف ''اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ'' میں اردو کے پہلے سفر نامہ نگار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اب آیئے ''تاریخ انگلستان'' از سید فضا حسین عرف نبی بخش کی جانب۔ یہ قدیم ترین سفر نامہ ایک جنگی مہم سے متعلق ہے۔ اس سفر نامے میں سفر کا آغاز ۲۵ رشعبان ۱۲۵۵ھ مطابق ۳ رنومبر ۱۸۳۹ء کو شاہ جہاں کے کابل کی طرف چڑھائی سے ہوتا ہے۔ یہ سفر نامہ داستانوی رنگ لئے ہوئے ہے اور روزنامچے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ بغور دیکھیں تو اس کی طرز تحریر میں ''تاریخ یوسفی'' از یوسف خاں کمبل پوش کے مقابلے میں قدامت اور ثقالت کا احساس ہوتا ہے۔ حالانکہ یوسف خاں کمبل پوش حیدر آبادی نے ۱۲۴۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں سفر اختیار کیا اور سید فدا حسین عرف نبی بخش نے ۱۲۵۵ھ مطابق ۱۸۳۹ء کی روداد بیان کی ہے۔ لیکن کسی تحریر یا تصنیف کی قدامت کا انحصار ہمیشہ زمانہ تصنیف پر ہوتا ہے۔ یوں ان دونوں تصانیف کا باہم مقابلہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ''تاریخ افغانستان'' کے نمونے عبارت میں ثقالت کا سبب اس کا زمانہ تصنیف ہی ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش نے سفر (۱۸۲۸ء) کا آغاز بلاشبہ پہلے کیا لیکن ''تاریخ افغانستان'' از سید فدا حسین کا زمانہ تصنیف و طباعت ۱۸۳۹ء ہے اور ''تاریخ یوسفی'' از یوسف خاں کمبل پوش کا زمانہ تصنیف لگ

بھگ ۱۸۴۶ء اور سنہ طباعت ۱۸۴۷ء یوں زمانہ تصنیف اور سنہ طباعت کے اعتبار سے ''تاریخ افغانستان'' کو ''تاریخ یوسفی'' پر پانچ تا چھ برس کا زمانی تفوق حاصل ہے۔ نیز تحریر کی ثقالت اور روز نامچہ تحریر کرنے کی تواریخ کے داخلی شواہد یعنی سنین کے مطابق اردو کا پہلا سفر نامہ نگار سید فدا حسین نبی بخش ہی قرار پاتا ہے اور اردو کا پہلا سفر نامہ ''تاریخ افغانستان'' ہے نہ کہ ''تاریخ یوسفی المعروف عجائبات فرنگ۔'' (۲۰)

مرزا حامد بیگ نے ''تصنیف کی قدامت کا انحصار زمانہ تصنیف پر ہونا چاہیے'' یہ کہہ کر ایک نئی بحث کو جگہ دے دی ہے۔ مرزا حامد بیگ نے آگے یہ بھی واضح کیا کہ ''عجائبات فرنگ'' کی نثر زیادہ صاف ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ سفر نامہ ''تاریخ افغانستان'' کے بعد تحریر کیا گیا ہے۔ ''تاریخ یوسفی'' کو بلا تصدیق پہلا سفر نامہ شمار کرنے میں مزید ایک الجھن در پیش ہے۔ مرزا حامد بیگ اکرام چغتائی کا حوالہ دیتے ہوئے اس سفر نامے کے متن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اکرام چغتائی نے اپنے مضمون کی تیسری قسط مطبوعہ ''نوائے وقت'' راولپنڈی مورخہ ۲۸/فروری ۱۹۸۴ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ کے فارسی مخطوطات کی فہرست مرتبہ: ایوانوف (مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۴ء ص ۱۲۴ تا ۱۲۵ نمبر شمارہ ۲۸۹) کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سفر نامہ ''تاریخ یوسفی'' از یوسف خاں کمبل پوش کے اصل فارسی متن کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مذکورہ فہرست کے مطابق اس سفر نامے کا اصل فارسی متن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اور فارسی متن پر مصنف کا نام ''یوسف خان کلیم پوش'' رقم ہے۔''

''محولہ بالا فہرست کے مطابق اس سفر نامے کے فارسی متن کی ترتیب کا سال ۱۲۵۹ھ بمطابق ۱۸۴۳ء قرار پاتا ہے۔ جبکہ یہ تحریر ملکہ وکٹوریہ اول کے نام معنون کی گئی۔ اس قلمی مخطوطہ کے کل اوراق ۲۳۵ ہیں اور فی صفحہ گیارہ سطریں ہیں۔ ہندوستانی خطِ نستعلیق میں یہ نسخہ معمولی قسم کے نقش و نگار سے مزئین ہے۔'' (۲۱)

ڈاکٹر مظہر احمد نے ۲۰۱۲ء میں ''تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ'' کی تحقیق و تدوین کی ہے۔ وہ اکرام چغتائی کے اس حوالے کو دوہراتے ہوئے کہتے ہیں:

''دویم یہ کہ یوسف خاں کمبل پوش نے یہ سفر نامہ پہلے فارسی میں لکھا تھا۔ بقول اکرام

چغتائی کا سن تالیف ۱۸۴۳ء ہے اور مادہ تاریخ چہ حال غریب ہے۔ مگر یہ فارسی مخطوطہ کبھی زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اس کی اطلاع ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) میں موجود فارسی مخطوطات کی فہرست میں دی گئی ہے۔'' (۲۲)

ڈاکٹر خالد محمود نے اپنی تصنیف ''اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ'' میں محمد اکرام چغتائی کے حوالے سے اس بات کو دہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سفر نامہ فارسی میں لکھا گیا تھا، جس کا اصل متن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور فارسی متن پر مصنف کا نام یوسف خاں کلیم پوش رقم ہے۔ محقق کی خواہش تھی کی اردو کے اس اولین سفر نامے کے فارسی مخطوطے کا بچشم خود مشاہدہ کرے لیکن ڈاکٹر خالد اشرف ''عجائبات فرنگ'' کا جائزہ لیتے ہوئے اس سفر نامے کے ناپید ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ سفر نامہ ابتداً فارسی میں تحریر کیا گیا تھا جس کا مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (کلکتہ) کیٹلاگ میں مندرجہ ہے۔ اولین اشاعتِ اردو، دلی کالج کے مطبع العلوم میں ہوئی۔ یہ نسخہ فی الحال ناپید ہے۔ اسی لئے اس کے ترجمہ نگار کا سراغ نہیں ملتا۔ تاریخ یوسفی کی قسطیں ماسٹر رام چندر کے جریدے، محبّ ہند اور دلی کالج کے مجلّے، ''قران السعدین'' میں چھپی تھی۔'' (۲۳)

اگر چہ اکرام چغتائی کی بات کو صحیح مان لیا جائے جیسا کہ سفر نامہ کے محققین نے اپنی تصانیف میں درج کیا ہے، تو ''عجائبات فرنگ'' کو اردو سفر ناموں میں جو مقبولیت حاصل ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ سفر نامہ فارسی میں تحریر کیا گیا تھا تو ہمارے پاس قباد بیگ، محمد حسین اندلسی، منشی اعتصام الدین اور مرزا ابو طالب اصفہانی کے سفر نامے موجود ہیں۔ ''شگرف نامہ ولایت'' اور ''میر طالبی فی بلاد افرنجی'' کے مخطوطے آج تک محفوظ ہیں اور یہ سفر نامے قدامت کے لحاظ سے عجائبات فرنگ سے تقریباً ۳۰ ربرس پہلے تحریر کیے جا چکے تھے۔ تراجم شدہ سفر نامے اور طبع زاد سفر نامے کی اولیت میں فرق ہوتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ''عجائبات فرنگ'' کو ''تاریخ افغانستان'' کے شائع ہونے سے پہلے ترجمہ کیا گیا تو پھر بھی ہمارے پاس یہ ثبوت نہیں ہے کہ اس سفر نامے کا ترجمہ کس نے کیا۔ اور اگر یہ قیاس بھی لگایا جائے کہ اس سفر نامے کا ترجمہ یوسف خاں کمبل پوش نے ہی کیا تھا تب بھی ہم یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ اس سفر نامے کا ترجمہ کب شائع ہوا۔

اردو کے اولین سفر ناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قدسیہ قریشی اپنی تصنیف ''اردو سفر نامے انیسویں صدی

میں‘‘ میں رقم طراز ہیں:

’’مثنوی نادر اردو سفر ناموں میں دو اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ اول یہ کہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے، اب تک جتنے سفر نامے دستیاب ہوئے ہیں ان میں تاریخی اعتبار سے قدیم ترین بھی ہے۔ اس کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ منظوم سفر نامہ ہے۔ عام طور پر جتنے سفر نامے لکھے گئے ہیں وہ نثر میں ہیں لیکن یہ سفر نامہ مثنوی کی شکل میں لکھا گیا ہے، اور مثنوی نادر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سفر نامہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ ڈاکٹر قطب انساء ہاشمی کی کتاب ’’تین مسافر‘‘ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر نامہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ کتب خانہ کو یہ نسخہ ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی نے عطیہ کے طور پر دیا تھا۔ مخطوطہ کے پہلے صفحہ پر ہاشمی صاحب کے دستخط کے ساتھ تحفہ بہ کتب خانہ ادارہ ادبیہ تحریر ہے۔ تذکرہ مخطوطات صفحہ ۱۴۲ پر بھی (ادارہ ادبیات اردو) درج ذیل تحریر ملتی ہے:

’’یہ نسخہ نصیر الدین ہاشمی کا عطیہ ہے۔ سرورق پر ان کے دستخط ہیں۔‘‘ (۲۴)

ڈاکٹر قدسیہ قریشی نے قطب انساء ہاشمی کی اس سفر نامے کے بارے میں تحریر کردہ معلومات کو جوں کا توں نقل کیا ہے، کیونکہ یہ سفر نامہ اب موجود نہیں ہے۔ وہ اپنی تصنیف میں اس سفر نامے کا احوال اس طرح درج کرتی ہیں:

’’مخطوطہ مثنوی نادر کا پہلا ورق غائب ہے۔ دوسرا ورق حمد کے اشعار سے شروع ہوتا ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ حمد ہی کے چند اشعار ورق اول کے صفحہ (الف) پر ہوں گے۔ بقیہ بیالیس اوراق پر مشتمل مثنوی تاریخ تصنیف کے قطعے پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے ہر صفحہ پر (۱۱) اشعار ہیں۔ چنانچہ موجودہ شکل میں کل (۸۸۶) شعر ہم تک پہنچے ہیں۔ خط نستعلیق نہایت اعلیٰ عنوان سرخی میں۔‘‘

مثنوی کے آخر میں ایک قطعہ درج ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر ۱۲۳۸ھ میں کیا گیا تھا اور اسی سال ’’مثنوی نادر‘‘ مکمل کی ہے:

کیا ہے سفر جب شہ نیک خو
کہ بارا سواڑتیسواں سن تھا وہ

اسی ہی سن میں کر فکر نظم کلام
کیا اس سفرنامہ کو انتظام
بدل جب کہ تاریخ کی فکر کی
نداہاتف غیب نے تب یہ دی
صلہ اس کا تجھ کو ملے بہترین
یہ نادر ہوئی مثنوی آفرین

۱۲۳۸ھ

۱۸۲۳ء۔'' (۲۵)

غرض کہ اگر قدامت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ''مثنوی نادر'' ۱۸۲۳ء میں رقم ہوئی ہے۔ اس لیے اولیت کا شرف اس مثنوی سفرنامے کو حاصل ہوتا ہے۔

اگر ہم فنی لحاظ سے سفرناموں کا تجزیہ کریں کہ کون سا سفرنامہ فن پر کھرا اترتا ہے اور کس سفرنامے پر جدید سفرنامے کی اصطلاح کا اطلاق مکمل طور پر کیا جا سکتا ہے تو بلاشبہ اولیت کا سہرا یوسف خاں کمبل پوش کے سر باندھا جا سکتا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائبات فرنگ'' ہر لحاظ سے ایک مکمل سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ اپنے اسلوب، زبان و بیان کی بے ساختگی، حقیقت نگاری اور منظر نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ بہت سے محققین نے اس سفرنامے کو فنی طور پر یا سفرنامے کی جدید اصلاح کے مطابق اردو زبان کا باضابطہ پہلا سفرنامہ قرار دیا ہے جو کہ بالکل بجا ہے۔

اردو ادب میں سفرنامے کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ اس طویل عرصے میں بہت سے سفرنامے عالمِ وجود میں آئے۔ جہاں تک اردو سفرنامے کی روایت اور اس کے آغاز و ارتقاء کی بات ہے تو اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کا سب سے پہلا باقاعدہ سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا ''تاریخ یوسفی'' المعروف بہ ''عجائبات فرنگ'' ہے۔ ۱۸۴۷ء میں یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائباتِ فرنگ'' زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا جو اردو ادب کا اولین سفرنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ سفرنامہ اردو کا پہلا سفرنامہ ہونے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی صفائی، بے ساختگی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے ایک اہم ادبی شہ پارہ بھی ہے۔ اس کے بعد سے ہی اردو ادب میں سفرنامہ نگاری کی زلفیں دراز ہوتی چلی گئیں۔ حالانکہ اردو میں سفرناموں کی ایک طویل فہرست ہے جس کو یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔ کچھ

سفرناموں کی طرف نظر ضرور جاتی ہے جو میرے مطالعے میں شامل رہے ہیں۔

''تاریخ یوسفی''المعروف بہ''عجائبات فرنگ''(یوسف خاں کمبل پوش):

اردو کا باضابطہ پہلا سفرنامہ''تاریخ یوسفی''میں یقیناً حسن یوسف کا جمال موجود ہے اور جو بھی اس سفرنامے کا مطالعہ کرتا ہے، اس کی خوبیوں اور پُر رعنائیوں پر قربان ہو جانا چاہتا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش ۳۰/مارچ ۱۸۳۷ء کو انگلستان کے لیے روانہ ہوئے اور بہ راستۂ مصر ۲۲/اپریل ۱۸۳۸ء کو بمبئی کے ساحل پر واپس آئے۔ اور ۱۸۴۷ء میں پنڈت دھرم نرائن کے زیرِ اہتمام مطبع العلوم، دہلی سے''تاریخ یوسفی''کے عنوان سے طبع کیا۔''تاریخ یوسفی''کی اشاعت اوّل بابت ۱۸۴۷ء کے بعد نہ معلوم کس بنا پر اس سفرنامے کو''عجائبات فرنگ''کے نام سے منشی نول کشور نے ۱۸۷۳ء اور پھر ۱۸۹۸ء میں طبع کیا۔ اور تقریباً ایک صدی کے بعد ۱۹۸۳ء میں پاکستان میں تحسین فراقی نے مع مقدمہ وحواشی کے ساتھ شائع کیا۔ اکرام چغتائی نے بالترتیب''عجائبات فرنگ''اور''تاریخ یوسفی''کے نام سے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر مظہر احمد نے اسے مرتب کر کے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر خالد محمود اس سفرنامے کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عجائبات فرنگ کی صرف یہی ایک خوبی نہیں کہ وہ اردو کا پہلا سفرنامہ ہے۔ پہلا سفرنامہ ہونا تو اس کی تاریخی خصوصیت ہے۔ ورنہ اسے پہلا سفرنامہ ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا اور یہ کسی اور نمبر پر رہتا تو بھی زبان و بیان کی بے باکی، بے ساختگی، وارفتگی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے اس کی شہرت اور اہمیت میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلاشبہ اس کی شہرت اتنی ہی ہوتی جتنی آج ہے۔'' (۲۶)

تاریخ افغانستان (سید فدا حسین):

اردو سفرناموں کے ابتدائی دور میں تاریخی اہمیت کے حامل سفرناموں میں سفرنامہ''تاریخ افغانستان''کا بھی شمار ہوتا ہے۔ سید فدا حسین کو مرزا حامد بیگ پہلا سفرنامہ نگار تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے سید فدا حسین کے احوال و کوائف پیش کرنے کے لیے''تاریخ افغانستان''کے اقتباس کو نقل کیا ہے۔ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

> ''امابعد، یہ آوارہ عاجز و ناکارہ درماندہ درافتادہ سید فدا حسین عرف نبی بخش بخاری

الحیدری نسب علاقہ روزگار سرکار انگریزی میں بعہدہ جمعداری ترک سواروں میں ملا
زم ہوا تھا۔ عاصی بھی چار و نا چار بندگی و بے چارگی مثل مشہور ہے سب دوست یگانہ
سے رخصت ہو کر مستعد آمادہ سفر ہوا۔ تاریخ ۳ ر ماہ نومبر ۱۸۳۹ء مطابق ۲۵ ر شعبان
۱۲۵۵ھ کو شاہ جہاں آباد سے دو تین منزل آ گے گئی تھی کہ قضائے الٰہی سے بیماری
ہیضہ وبا کی فوج میں پڑ گئی۔'' (۲۷)

سید فدا حسین نے اپنے اس سفر میں فوجی مقصد کے حصول کے علاوہ گرد و پیش کے مناظر اور واقعات پر بھی نظر رکھی اور میرٹھ سے غزنی کی آمد و رفت کی تفصیل کو روز نامچے کی شکل میں تحریر کیا ہے۔

سیاحت نامہ (نواب کریم خاں):

''سیاحت نامہ'' نواب کریم خاں کا ایک اہم سفر نامہ ہے۔ سیاحت نامہ بھی اردو سفر ناموں کے ابتدائی دور کا سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامے کے بارے میں ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:

''نواب کریم خاں ۱۸۳۹ء میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت
میں ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں لندن گئے تھے۔ ''سیاحت نامہ'' ان کے اسی
دور کی یادگار ہے۔ نواب کریم خاں کی عادت تھی کی وہ روزآنہ کے امور کو ڈائری میں
بڑی باقاعدگی سے درج کر دیتے تھے، چنانچہ اس ڈائری میں لندن کی تہذیبی، معا
شرتی اور ثقافتی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔'' (۲۸)

نواب کریم خاں جھجر نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ یوسف خاں کمبل پوش کے ہم عصر سفر نامہ نگار تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''سیاحت نامہ'' کے قلمی نسخے کی دریافت کی اور پھر اسے ادارۂ ادب و تنقید، لاہور سے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔

سفر نامہ سیر المحتشم (محتشم الدولہ نواب غوث محمد خاں):

۱۸۵۷ء سے پہلے تحریر کردہ سفر ناموں میں ''سیر المحتشم'' کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ نواب غوث محمد خاں ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں سارنگ پور، گوالیار، دھول پور، اکبر آباد، لکھنؤ، قنوج، فرخ آباد، دہلی، جے پور، ٹونک، اجمیر شریف، چتوڑ اور اندور گئے اور اسی سفر کی روداد کو اس سفر نامے میں قلمبند کیا ہے۔ راقم کو اس سفر نامے کے ماخذ تک

رسائی حاصل نہیں ہوسکی۔اس سفرنامے کے مرتب ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اس کے بارے میں بنیادی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔وہ اس سفرنامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''نواب صاحب نے سیر المحتشم کے نام سے اپنا ایک سفرنامہ ترتیب دیا تھا جس کی اشاعت ۱۲۶۶ھ النبوی مطابق ۱۸۵۰ء میں عمل میں آئی۔اس کا سرورق بہت دیدہ زیب اور کلاسیکی طرز آرائش بہت عمدہ نمونہ ہے۔اس نادر اشاعت کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔'' (۲۹)

مرتب کی پیش کردہ تفصیل کی وجہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سفرنامے کا مشاہدہ انہوں نے بچشم خود کیا ہے۔تنویر احمد علوی کے مطابق سفرنامے کی کتابت اچھے خاصے جعلی قلم سے ہوئی ہے۔سفرنامہ کے صفحات پر جگہ جگہ زینت اور زیبائش اوراق کے لیے گل بوٹے بنائے گئے ہیں۔مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفرنامہ اندرون ملک کی سیاحت پر تحریر کردہ سفرناموں میں قابلِ ذکر ہے۔

اردو سفرناموں کے ابتدائی دور میں سفرنامے لکھنے کا اصل مقصد معلومات رقم کرنا ہوتا ہے۔اس دور میں سفرناموں کی روایت زیادہ مستحکم نہیں تھی بطور صنفِ ادب سفرنامے کا وجود نہ کے برابر تھا۔لیکن اردو سفرناموں کی ابتدائی دور میں ہی یوسف خاں کمبل پوش جیسا سفرنامہ نگار دستیاب ہوا ہے۔''تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ''،''تاریخ افغانستان''،''سیاحت نامہ''اور''سیر المحتشم''ابتدائی دور کے سفرنامہ ہونے کے باوجود اپنی ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔اوران سفرناموں نے اردو میں سفرناموں کی روایت کو فروغ دینے میں ایک مستحکم بنیاد قائم کی ہے،جس کی وجہ سے آگے چل کر اردو ادب میں سفرناموں کی بلند و بالا عمارت قائم ہوسکی۔۱۸۵۷ء کے بعد جیسے جیسے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی میں استحکام حاصل ہوا،سفر کی شروعات ہوئی اور اردو میں بہترین سفرنامے بھی تحریر کیے جانے لگے۔

تاریخ انگلستان (مولوی مسیح الدین علوی):

''تاریخ انگلستان'' مولوی مسیح الدین علوی کا ایک اہم سفرنامہ ہے۔اس سفرنامے کے عنوان سے ہی ہمارا ذہن انگلستان کی تاریخ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔مولوی مسیح الدین کا سفرنامہ''تاریخ انگلستان''،''سفرنامہ لندن''کے نام سے بھی مشہور ہوا۔جب ریاستِ اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ کو انگریزی حکومت نے معزول کردیا تو مولوی مسیح الدین کو

ریاستِ اودھ کی بحالی کی غرض سے سفیر بنا کر انگلستان روانہ کیا گیا۔مولوی مسیح الدین کے سفر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ مسیح الدین علوی ۱۸/جون ۱۸۵۶ء کو کلکتہ سے انگلستان گئے اور تقریباً ساڑھے سات سال انگلستان میں قیام کرنے کے بعد وطن کی طرف واپس روانہ ہوئے۔مسیح الدین علوی حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کرنے کے بعد ۲۳/دسمبر ۱۸۶۵ء کو وطن واپس پہنچے۔''سفیر اودھ''انہیں ایام کا سفر نامہ ہے۔'' (۳۰)

ڈاکٹر خالد محمود انور سدید کی اس رائے کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ''سفیر اودھ'' علاحدہ سے کوئی سفر نامہ نہیں بلکہ مسیح الدین کے''تاریخ انگلستان'' کا ہی ایک حصہ ہے۔وہ اس سفر نامے کے بارے میں مزید معلومات دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''تاریخ انگلستان بڑے سائز کے ۱۵۳۷ صفحات،مقدمہ کے پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاکوری شریف میں محفوظ ہے۔اس نسخے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۵/ستمبر ۱۸۷۱ء کو ہوئی۔''
> (۳۱)

مسیح الدین علوی کا سفر نامہ''تاریخ انگلستان''انتہائی اہمیت کا حامل ہے،کیونکہ انہوں نے ایک طویل عرصے تک انگلستان میں قیام کیا اور سفارتی عہدے پر معمور ہونے کی وجہ سے شاہی دربار تک ان کی رسائی ہوئی۔مسیح الدین علوی نے اس سفر نامے میں انگلستان کی تفصیل کے ساتھ ساتھ حکومتِ اودھ اور واجد علی شاہ اور ان کے مصاحبین کی ریشہ دوانیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے اپنے سفر نامے میں باغیوں کی شرارتیں،مصاحبینِ اودھ کی مکاریاں اور اس کے علاوہ برطانیہ کی تہذیب وتمدن،تعلیم اور صنعت وحرفت کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

مسافران لندن (سرسید احمد خاں):

سرسید احمد خاں کا سفر نامہ''مسافران لندن''نہ صرف ایک مشہور سفر نامہ ہے بلکہ اپنے قوم کے لیے ایک جہاں دیدہ شخص کے تجربات کا نچوڑ ہے۔سرسید کا سفر نامہ ایک ایسے مسافر کا سفر نامہ ہے،جو تلاش علم و ہنداور ترقی و کامرانی کی خصوصیت جاننے کے لیے نکلا تھا اور اپنے سفر نامے میں اس کامیابی کی شاہ کلید کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔سرسید احمد

خاں کے سامنے سفر کے دومقاصد پیشِ نظر تھے،ایک تو وہ انگلستان کے طریقہ تعلیم ،تہذیب وتمدن اور ترقی کی وجوہات کو جاننا چاہتے تھے۔دوسرا وہ ولیم میور کی بیہودہ کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا مدلل جواب دینا چاہتے تھے۔اسی مقاصد حصول کی غرض سے سر سید احمد خاں یکم اپریل ۱۸۶۹ءکو برودہ خانی جہاز سے لندن کے لیے روانہ ہوئے۔سر سید کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود، خدمت گار عظیم اللہ عرف چھجو اور ایک قریبی شناسا مرزا خداداد بیگ تھے۔سر سید احمد خاں ۴/ستمبر ۱۸۷۰ءتک لندن میں رہے۔اس دوران انہوں نے سکریٹری سائنٹیفک سوسائٹی راجہ جے کشن داس کو انگلستان سے خطوط لکھے جو سائنٹیفک سوسائٹی کے رسالے میں شائع ہوا۔''مسافران لندن'' کو اسمٰعیل پانی پتی نے مرتب کیا اور یہ بامکمل سفر نامہ مجلس ترقی ادب، لاہور نے پہلی بار ۱۹۶۱ءمیں شائع کیا۔اصغر عباس نے اس سفر نامے کو تازہ اضافوں مقدمہ،فرنگ اور تعلیقات کے ساتھ مرتب کر کے ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ سے شائع کروایا۔مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''مسافران لندن''اردو زبان کا ایک نہایت اہم اور دلچسپ سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے میں ہمیں انگلستان کی زندگی،تہذیب وتمدن،تاریخ وجغرافیہ نیز تعلیمی نظام کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل ہوتی ہے۔زبان وبیان اور اسلوب کی وجہ سے یہ اردو کا بہترین سفر نامہ ہے۔

''سفر نامہ پنجاب'' سر سید احمد خاں کا دوسرا سفر نامہ ہے۔سفر نامے کے فن پر انور سدید، خالد محمود اور مرزا حامد بیگ نے بنیادی کام کیا ہے،ان تمام لوگوں نے ''سفر نامہ پنجاب'' کو سر سید کے سفر نامے میں شامل کیا ہے۔یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اس میں سر سید کے پنجاب کے سفر کی روداد شامل کی گئی ہے۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ سر سید نے ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے مختلف اضلاع کا سفر کیا تھا۔اس سفر میں سر سید کے رفیق خاص مولوی اقبال علی بھی شریکِ سفر تھے۔مولوی سید اقبال علی نے اسی سفر کی روداد کو مرتب کر کے ''سر سید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب'' کے عنوان سے ۱۸۸۴ءمیں شائع کیا۔اور شیخ اسمٰعیل پانی پتی نے اسے مرتب کر کے ۱۹۷۳ءمیں مجلس ترقی ادب، لاہور سے اور ۱۹۷۹ءمیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع کروایا۔مولوی سید اقبال علی زودنویس تھے اور انہوں نے سر سید کی تمام تقاریر کو سفر نامے کی شکل میں قلم بند کیا ہے۔اگر اس سفر نامے کا فنی تجزیہ کیا جائے تو عنوان کے علاوہ زیادہ تر متن سفر نامے کے تحت شمار نہیں کیا جا سکتا۔

سفرنامہ پامر (ایڈورڈ ہنری پامر):

''سفرنامہ پامر'' اور سفرنامہ نگار ہنری پامر کے بارے میں مرزا حامد بیگ اپنی تصنیف ''اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

> ''سفرنامہ پامر ایڈورڈ ہنری پامر کا ایک نایاب اور دوسرا سفرنامہ ہے جو ''اودھ اخبار'' لکھنؤ ۱۸۷۳ء میں قسط وار شائع ہوا۔ پامر بھی فرانسی مستشرقین گارساں دتاسی کی طرح کبھی ہندوستان نہیں آئے لیکن ان کی عربی، فارسی کے علاوہ اردودانی کی قابلیت کا اعتراف باوقار اہل قلم نے کیا ہے۔'' (۳۲)

یہ ہمارے لیے بڑی تعجب کی بات ہے کہ ایسا شخص جو کبھی ہندوستان نہیں آیا اس نے اردو زبان سیکھی اور سفرنامہ بھی تحریر کیا۔ یہ بات صنفِ سفرنامہ کی مقبولیت کا ثبوت ہے کہ ایک اجنبی نے اردو زبان میں سفرنامہ تحریر کیا ہے، جس نے کبھی ہندوستان نہیں دیکھا اور نہ ہی اردو زبان سیکھی۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہنری پامر کا سفرنامہ زبان و بیان کی انفرادیت لیے ہوئے ہے اور اس سفرنامے کی وجہ سے اردو سفرنامے کی روایت میں مستشرقین سفرنامہ نگار کا اضافہ ہوتا ہے۔

نواب محمد عمر خاں کے سفرنامے:

نواب محمد عمر خاں بہادر فیروز جنگ ریاست محمد گڑھ (باسودہ) کے نواب تھے۔ نواب محمد عمر خاں کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ سیاحت میں گزارا۔ محمد عمر خاں کو نہ صرف سیاحت کا شوق تھا بلکہ سفرنامے تحریر کرنے کا بھی شوق تھا۔ انہوں نے اپنے سفر کے تمام مقامات کے احوال کو مختصر سفرناموں میں قلمبند کیا ہے۔

''زادِ سفر'' نواب محمد عمر خاں کا پہلا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ اندرونِ ملک کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سفر میں نواب محمد عمر خاں نے کلکتہ، لکھنؤ، حیدرآباد، لاہور اور دیگر اضلاع کی سیر کی اور اپنے سفرنامے میں ان شہروں کی تفصیل کو درج کیا ہے۔

''زادِ غریب'' نواب محمد عمر خاں کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامے میں نواب محمد عمر خاں نے حج کی تفصیلات کو درج کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ''زادِ غریب'' کے عنوان سے ۱۳۰۷ھ میں مطبع محمدی میرٹھ سے منشی محمد خلیل نے شائع کروایا۔

''زادِغریب'' کے نام سے ہی مطبع کشور ہند سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔قدسیہ قریشی کے مطابق اس سفر نامے میں اشعار، قصیدہ،قطعہ،غزل،مناجات وغیرہ سبھی شامل ہیں۔سفر نامہ ''زادِغریب'' سیاحوں کے لیے اہم کتاب ہے جس میں حج اورارکان حج کے بیان کے ساتھ ساتھ عرب،عراق،عجم اور مصر وشام کی اسلامی تہذیب اور سماجی زندگی کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔

''آئینہ فرنگ'' نواب محمد عمر خاں کا تیسرا سفر نامہ ہے۔نواب محمد عمر خاں نے ۱۸۸۸ء میں یورپ کی سیر کی اور اسی سیر کی روداد کو ''آئینہ فرنگ'' کا نام دیا۔اس سفر نامے میں لندن، پیرس،اٹلی،سویٹزر لینڈ اور ترکی وغیرہ کے حالات پیش کیے گئے ہیں۔

''نیرنگ چین'' نواب محمد عمر خاں کا چوتھا سفر نامہ ہے۔نواب محمد عمر خان نے ۱۸۹۱ء میں چین کا سفر کیا۔اس سفر نامے میں انہوں نے چین کے سفر کی تفصیل کو قلمبند کیا ہے۔یہ سفر نامہ ''نیرنگ چین'' (ارژنگ چین) کے عنوان سے مطبع نظامی،کانپور سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔

''نیرنگ رنگون'' نواب محمد عمر خاں کا پانچواں سفر نامہ ہے۔نواب محمد عمر خاں نے اپنے اس سفر نامے میں ملک برما کی سیر کی داستان کو قلم بند کیا ہے۔

''سفر نامہ رئیس'' نواب محمد عمر خاں کا چھٹا سفر نامہ ہے۔''سفر نامہ رئیس'' سری لنکا کے سفر کی روداد ہے۔ ہندوستان کے سری لنکا سے قدیم تعلقات تھے،شاید اسی وجہ سے نواب محمد عمر خاں نے سری لنکا کی سیر ۱۳۰۳ھ میں کی اور اسی سیر کی کیفیت کو انتہائی اختصار کے ساتھ ۲۴ صفحات میں قلمبند کیا ہے۔یہ سفر نامہ ۱۳۰۳ھ میں محمد عبدالرحمٰن کے زیر اہتمام مطبع نظامی،کانپور سے شائع ہوا۔

''فرہنگ فرنگ'' نواب محمد عمر خاں کا ساتواں سفر نامہ ہے۔۱۸۹۱ء میں نواب محمد عمر خاں ایک بار پھر مغرب کے سفر پر روانہ ہوئے۔اس سفر میں انہوں نے ماسکو،بلغراد،بلجیم، جرمنی اور یورپ کے کئی شہروں کے سفر کی تفصیل کو پیش کیا ہے۔یہ سفر نامہ مطبع گلزار،میرٹھ سے محمد خلیل کے زیر اہتمام اپریل ۱۸۹۱ء مطابق ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا۔

''قند مغربی'' نواب محمد عمر خاں کا آٹھواں سفر نامہ ہے۔نواب محمد عمر خاں نے اندلس کے سفر کی روداد کو سفر نامہ ''قند مغربی'' میں قلمبند کیا ہے۔اس سفر نامے میں انہوں نے مسجدِ قرطبہ اور قصر الحمراء کی شان وشوکت کو بیان کیا

ہے۔انور سدید کے مطابق ان کا یہ سفر نامہ دیگر سفر ناموں میں ممتاز مقام پر فائز ہے۔

تواریخ عجیب (مولانا جعفر تھانیسری):

''تواریخ عجیب''المعروف بہ''کالا پانی''مولانا جعفر تھانیسری کا ایک اہم سفر نامہ ہے۔۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد مولانا تھانیسری کو کالے پانی کی سزا دی گئی تھی۔تواریخ عجیب میں سزا کے طور پر کالا پانی میں گزارے گئے اٹھارہ سال کی لرزہ خیز داستان رقم ہے۔بعض ناقدین اسے سفر نامہ شمار کرتے ہیں اور بعض خودنوشت سوانح لیکن یہ تصنیف جزوی سفر نامہ ہے اور جزوی خودنوشت سوانح۔اس تصنیف میں ایک طرف انڈومان کی زندگی کی تفصیل پیش کی گئی ہے تو دوسری طرف انگریزوں کے ظلم وستم کے حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔مولا جعفر تھانیسری تقریباً اٹھارہ سال کی قید کے بعد ۱۸۸۳ء میں واپس آئے اور انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان کو''کالا پانی''میں رقم کیا ہے۔یہ سفر نامہ سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔

مسیر حامدی (نواب محمد حامد علی خاں):

''مسیر حامدی''ریاست رام پور کے نواب محمد حامد علی خاں نورِنظر حکومت انگلستان کے ۱۸۸۳ء میں کیے گئے ایک سالہ سفر کی روداد ہے۔نواب محمد حامد علی خاں ۳/مارچ ۱۸۸۳ء کو سفر پر روانہ ہوئے اور ۴/مارچ ۱۸۸۴ء کو وطن واپس لوٹے۔نواب محمد حامد علی خاں سر آکلینڈ کلون لیفٹینٹ گورنر کی دعوت پر انگلستان تشریف لے گئے،جس کی وجہ سے ان کی انگلستان میں خوب پذیرائی ہوئی۔اس سفر نامے کو دو جلدوں میں شائع کیا گیا۔خالد محمود کے مطابق پہلی جلد میں ایشیا اور امریکہ کے سفر کا احوال ہے اور دوسری جلد میں یورپ اور مصر کی سیاحت کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ سفر نامہ ۱۸۹۶ء میں مطبع مفید عام،آگرہ سے شائع ہوا۔

سفر نامہ یورپ (مرزا اثار علی):

''سفر نامہ یورپ''مرزا اثار علی کا تحریر کردہ سفر نامہ ہے۔انہوں نے ۱۸۸۵ء میں یورپ کا سفر کیا۔یہ سفر نامہ ۱۸۹۰ء میں''سفر نامہ یورپ''کے نام سے شائع ہوا۔اس سفر میں انہوں نے یورپ کو ایک ناقد کی نظر سے دیکھا ہے۔دراصل ان کا یہ سفر نامہ علمی نوعیت کا تھا،جس میں انہوں نے یورپ کے رسم و رواج،تہذیب وتمدن،طرز معاشرت

اور طریقہ تعلیم وغیرہ کا تفصیلی احوال قلم بند کیا ہے۔

سیر ایران (مولانا محمد حسین آزاد):

''سیر ایران'' مولانا محمد حسین آزاد کا روزنامچہ ایران اور ایک دلچسپ لکچر ہے، جسے آغا محمد طاہر نبیرہ نے کریمی پریس، لاہور میں شائع کروایا، جو ۱۹۲ر صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس سفر کا آغاز ۲۳ر ستمبر ۱۸۸۵ کو شروع کیا وہ بذریعے ریل لاہور سے کراچی پہنچے، کراچی میں دس روز قیام کے بعد ۱۲ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کو عربیہ نامی بحری جہاز کے ذریعے ایران گئے۔ محمد حسین آزاد ایران سے تقریباً ۱۰ر ماہ کی سیاحت کے بعد ۲۴ر جولائی ۱۸۸۶ء کو لاہور واپس آئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے ایران کے سفر کا مقصد فارسی کی لغت تیار کرنا تھا اور وہ کتابوں کی تلاش میں ایران گئے تھے۔ جس کا شمار آج اردو کے اہم ترین سفرناموں میں ہوتا ہے۔

محمد حسین آزاد نے ۱۸۶۵ء میں وسط ایشیاء کی سیر کی تھی۔ آزاد کی وسط ایشیاء کے سفر کی روداد کو آغا محمد اشرف نے مرتب کر کے سفرنامہ ''وسط ایشیاء کی سیر'' کے نام سے شائع کروایا۔ عمومی طور پر ''وسط ایشیاء کی سیر'' سفرناموں کی روایت میں آزاد کی ایک دین ہے جسے ادبی اہمیت حاصل ہے۔

سفر نامہ روم ومصر وشام (علامہ شبلی نعمانی):

علامہ شبلی نعمانی نے رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ یعنی ۲۶ر اپریل ۱۸۹۲ء کو اپنے سفر کا آغاز مسٹر آرنلڈ کی رفاقت میں کیا۔ شبلی نعمانی کا یہ سفر خالصتاً علمی تھا۔ انہوں نے اپنے سفرنامے میں اسلامی ممالک اور بطور خاص ترکوں کی اصلی حالت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی نعمانی ایک عظیم مورخ اور بلند پایہ انشاء پرداز تھے مگر اس سفرنامے میں انہوں نے اپنے اسلوب کی سادگی کو روا رکھا اور رنگین بیانی سے حتی الامکان گریز کیا ہے اور اس سفرنامے میں بہت سے تاریخی حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سفرنامہ مطبع مفید عام، آگرہ سے ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا۔

دہلی اور اس کے اطراف (مولانا حکیم سید عبدالحیٔ):

سفرنامہ ''دہلی اور اس کے اطراف'' مولانا حکیم سید عبدالحیٔ کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ مولانا سید عبدالحیٔ نے یہ سفر ۱۸۹۴ء میں کیا تھا۔ اس سفرنامے میں انہوں نے دہلی اور اس کے نواحی علاقوں کے علاوہ پانی پت، سرحد، دیوبند،

سہار نپور اور بجنور وغیرہ کی تفصیلات کو درج کیا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے اس پر حاشیہ تحریر کر کے اس سفر نامے کو ''معارف'' میں شائع کروایا۔اس سفر نامے کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور مولانا سید عبدالحئی کے فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اسے پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں کتابی شکل میں شائع کیا۔اردو اکادمی، دہلی نے ۱۹۸۸ء میں اسے از سرِ نو مرتب کر کے شائع کیا۔غرض کہ یہ سفر نامہ انیسویں صدی کے اواخر کی دہلی اور اسلامی تہذیب کا آئینہ ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہت سی ایسی معلومات جمع ہو گئی ہیں جو تاریخی کتابوں میں بھی ناپید ہیں۔قدسیہ قریشی اس سفر نامے کی سب سے بڑی خوبی اس کی زبان کو قرار دیتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ یہ چھبیس سالہ نوجوان مصنف کا لکھا ہوا سفر نامہ ہے، جس میں پختگی اور کمال پایا جاتا ہے۔نثر سلیس اور دلکش ہے جو سفر نامے میں ایک قسم کا زور اور تاثیر پیدا کر دیتی ہے۔

سفر نامہ بلادِ اسلامیہ (مولوی عبدالرحمٰن امرتسری):

مولانا عبدالرحمٰن امرتسری نے ۱۸۹۸ء میں مصر، شام، روم اور ترکی کا سفر کیا۔اس سفر کی روداد کو انہوں نے ''سفر نامہ بلادِ اسلامیہ'' میں بڑے دلچسپ انداز میں رقم کیا ہے۔یہ سفر نامہ ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔اس سفر نامے میں مولوی عبدالرحمٰن امرتسری نے بڑے دلچسپ انداز میں مصر اور ترکی جیسے مملکت اسلامیہ کے بڑے شہروں کا ذکر کیا ہے۔ان کا سفر نامہ اسلامی ممالک کا ایک معاشرتی آئینہ ہے، جس میں انیسویں صدی کے اواخر کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔

اردو کے ابتدائی دور کے سفر ناموں پر تاریخ اور جغرافیہ کا غلبہ رہا ہے۔ابتدائی دور کے سفر نامہ نگاروں نے غیر جانب دار ہو کر مختلف ملکوں اور قوموں سے متعلق ہر قسم کی تہذیبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی اور سماجی معلومات فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے اور معلومات فراہم کرتے ہوئے غیر ضروری تخلیق کاری سے گریز کیا ہے۔ابتدائی دور کے سفر ناموں کے علاوہ اور بھی سفر نامے بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہی لکھے گئے ہیں۔انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک اردو سفر نامے نے کامیاب سفر کیا اور خوب ترقی کی۔اس طرح اردو سفر نامے کی روایت کافی مضبوط ہوئی۔

انیسویں صدی کی انتہا اور بیسویں صدی کی ابتداء اردو کے غیر افسانوی ادب کی ترقی کے دور مانے گئے

ہیں۔ چنانچہ بیسویں صدی کے ابتداء میں بہترین سفرنامے کی شکل میں بھی غیر افسانوی ادب میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ حالانکہ بیسویں صدی کے ابتداء کے سفرناموں کی ایک طویل فہرست ہے، جس کو یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔ کچھ سفرناموں کی طرف نظر ضرور جاتی ہے جو میرے مطالعے میں شامل رہے ہیں۔

سفرنامہ یورپ (منشی محبوب عالم):

منشی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء میں یورپ کا سفر کیا اور اسی سفر کی روداد کو ''سفرنامہ یورپ'' کے نام سے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا۔ منشی محبوب عالم کا ''سفرنامہ یورپ'' اردو زبان کا ضخیم ترین سفرنامہ ہے۔ منشی محبوب عالم کا پہلا سفر فرانس، انگلستان، روم، شام اور مصر کی سیاحت پر مبنی ہے۔ انہوں نے اپنے سفرناموں میں یورپ کی تہذیب و معاشرت، آداب و اخلاق، رسم و رواج اور موسموں کا حال غرض کہ ہر چیز کی تفصیل بیان کی ہے۔

''سفرنامہ بغداد'' منشی محبوب عالم کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی تحریر کردہ معلومات کے مطابق منشی محبوب عالم نے یہ سفر ۱۷/ مارچ ۱۹۱۷ء کو کیا۔ ڈاکٹر خالد محمود منشی محبوب عالم کے سفرناموں کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''سفرنامہ بغداد میں عرب و عراق کی تہذیب و تمدن کے علاوہ تاریخ و جغرافیہ کو بھی اہمیت دی گئی ہے لیکن یہ سفرنامہ ''سفرنامہ یورپ'' کا مقابلہ نہیں کرتا، نہ اس میں وہ ربط و روانی ہے اور نہ حیرت و شوق، البتہ دونوں سفرناموں کا اسلوب سادہ، زبان سلیس اور لہجے میں بے تکلفی ہے۔'' (۳۳)

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ منشی محبوب عالم کے سفرنامے اس دور میں لکھے گئے جب بیسویں صدی کا آغاز ہو رہا تھا۔ انہوں نے دونوں سفرناموں کے ذریعے ایک عمدہ مثال پیش کی جس کی وجہ سے بیسویں صدی میں اردو سفرناموں کی روایت میں بہت زیادہ ترقی ہوئی اور صنفِ سفرنامہ نے دیگر اصناف کے مقابل اپنا ایک علاحدہ مقام بنا لیا ہے۔

مقامِ خلافت (شیخ عبدالقادر):

شیخ عبدالقادر نے ۲۸/ جولائی ۱۹۰۶ء سے ۲۳/ ستمبر ۱۹۰۶ء تک تقریباً پونے دو مہینے ترکی میں قیام کیا اور اس قیام کی یادگار کو انہوں نے اردو روزنامچے اور خطوط کی شکل میں درج کیا ہے۔ اس سفر کی روداد کا نام ''مقامِ خلافت''

رکھا گیا۔ یقیناً سفر نامہ ''مقامِ خلافت'' سفرناموں کی روایت سے انحراف کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ عبدالقادر نے تر کی میں تقریباً پونے دو مہینے قیام کے دوران استنبول کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی و تہذیبی حالات کو بڑے خوبصورت انداز میں جمع کیا ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفرنامہ اردو سفرناموں کی روایت میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، جس میں عبدالقادر نے روایتی انداز کو ترک کرتے ہوئے اپنا ایک الگ انداز ایجاد کیا ہے۔

''سیاحت نامہ یورپ'' شیخ عبدالقادر کا دوسرا سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ تکنیک کے اعتبار سے ''مقامِ خلافت'' کی طرح خطوط اور روزنامچہ تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ غرض کہ شیخ عبدالقادر کے سفرنامے اردو زبان وادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

۱۹۰۷ء کا جاپان (ڈاکٹر حاجی محمد حسین):

''۱۹۰۷ء کا جاپان'' ڈاکٹر حاجی محمد حسین کا ایک اہم سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ خطوط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ انور سدید کی تحقیق کے مطابق یہ سفرنامہ طویل عرصے تک قعرِ گمنامی میں ڈوبا رہا۔ اس سفرنامے کو سید طفیل منگلوری نے تلاش کیا اور سیّد الطاف بریلوی کو رسالہ ''مصنف'' میں شائع کرنے کی غرض سے دیا۔ اختتام جنگ کے بعد یہ سفرنامہ پہلی بار ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور سے شائع ہوا۔ انہوں نے اپنے سفر کی خوبصورت روداد کو سفرنامہ ''۱۹۰۷ء کا جاپان'' میں قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین نے جاپانیوں کے عادات واطوار، رہن سہن اور طرز معاشرت کا بغائر مشاہدہ کیا اور تمام تفصیلات کو بڑے دلچسپ انداز میں تحریر کیا ہے۔

سیر یورپ (نازلی رفیعہ سلطان):

ویسے تو اردو میں یورپ کے سیر پر بہت سے سفرنامے لکھے گئے ہیں لیکن اس سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک مشرقی عورت کی نظر سے یورپی تہذیب ومعاشرت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے مطابق نازلی رفیعہ سلطان اردو کی پہلی خاتون سفرنامہ نگار ہیں، ان کا سفرنامہ ''سیر یورپ'' اردو میں خواتین کے ذریعے تحریر کردہ پہلا سفرنامہ ہے۔ نازلی رفیعہ سلطان ایک خاتون نواب ہیں۔ انہوں نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ ۱۹۰۸ء میں یورپ کا سفر کیا تھا۔ یورپ میں چھ ماہ قیام کے بعد وہ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ریاست جزیرہ واپس پہنچی۔ انہوں نے یہ سفرنامہ خطوط کی تکنیک میں لکھا ہے۔ یورپ کے قیام کے دوران نازلی رفیعہ سلطان نے اپنے ہندوستانی بزرگوں کو خطوط لکھے اور ان

خطوط کو زہرہ فیضی نے تاریخ وار مرتب کر کے سفر نامے کی صورت دی ہے۔

نقشِ فرنگ (قاضی عبدالغفار):

سفر نامے میں مشاہدات و محسوسات کو شامل کرنے کا اولین نقش ''نقشِ فرنگ'' میں نظر آتا ہے۔ قاضی عبدالغفار اردو ادب میں رومانوی نثر اور جذبات سے لبریز تحریروں کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' ان کی مشہور تصانیف ہیں لیکن قاضی عبدالغفار کا یہ سفر نامہ بھی دونوں تخلیقات سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ قاضی عبدالغفار ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کے ایک وفد کے ساتھ برطانوی حکومت کی دعوت پر مسائل مشرقیہ کے بارے میں گفتگو کرنے انگلستان گئے تھے۔ ''نقشِ فرنگ'' میں سفر نامہ نگار نے مغربی زندگی کو مشرقی آنکھ سے دیکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، جو ۱۹۲۴ء میں دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے شائع ہوا۔

سفر نامہ اُندلس (قاضی ولی محمد):

قاضی ولی محمد کسمنڈوی نے ۱۹۲۴ء میں اندلس (اسپین) کا سفر اختیار کیا۔ انہوں نے اس سفر کی روداد کو ''سفر نامہ اندلس'' میں قلمبند کیا ہے، جو ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ اس سفر نامے کو اس وقت تو بہت زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی لیکن پھر بھی اس سفر نامے کے تخلیقی اسلوب نگارش اور ناسٹلجیا کی وجہ سے اردو سفر ناموں میں انفرادی مقام حاصل ہے۔ قاضی ولی محمد نے اندلس کی مستند تاریخ لکھنے اور وہاں کے تاریخی ماخذات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے اندلس میں چار ماہ قیام کیا۔ وہ اپنے سفر نامے کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے اس میں سیر و تماشا، مجالس رقص و سرود، تجارتی گرم بازاری اور سیاسی جدو جہد کا بیان مختصر کیا ہے۔ انور سدید کا کہنا ہے کہ قاضی ولی محمد نے معنوی طور پر سفر نامے کے انداز میں تاریخ کی بازیافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی ولی محمد نے مزید دو سفر نامے ''سفر نامۂ مصر'' اور ''مغرب اقصیٰ'' تحریر کیے ہیں۔ مختصراً ''سفر نامہ اُندلس'' کے مطالعہ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سفر نامے کی وجہ سے قاضی ولی محمد کو اردو سفر ناموں کی روایت میں ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

سفر نامہ عراق (نشاط النساء بیگم):

نشاط النساء بیگم نے حسرت موہانی کے ساتھ حج بیت اللہ اور عراق کا سفر کیا۔ نشاط النساء نے ان دونوں اسفار

پر سفرنامے قلم بند کیے، جن میں پہلا ''سفرنامہ حجاز'' اور دوسرا ''سفرنامہ عراق'' ہے، جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بیگم حسرت موہانی کا ''سفرنامہ عراق'' ۱۹۳۷ء میں حسرت موہانی کے دیباچے کے ساتھ شائع ہوا۔ بیگم حسرت موہانی صرف سیاسی معاملات میں حسرت موہانی کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھیں بلکہ سفر میں بھی ان کا ساتھ دیتی تھیں۔ بیگم حسرت موہانی کا ''سفرنامہ عراق'' اردو کا ایک اہم سفرنامہ ہے، جس میں نسوانی نکتۂ نظر سے مقامات سیاحت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بیگم حسرت موہانی نے اپنے سفرنامے میں عراقی عورتوں اور ان کی گھریلو ذمہ داریاں ادا کرنے کا طریقہ، اولاد کی پرورش اور ان کے لباس وغیرہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سفرنامہ مشرق کے احوال خصوصاً عراق کی تہذیب وتمدن، معاشرت اور خواتین کی صورتِ حال کا جائزہ ہے۔

سیر افغانستان (سید سلیمان ندوی):

''سیر افغانستان'' سید سلیمان ندوی کا وہ سفرنامہ ہے جو انھوں نے ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ کی دعوت پر علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ کیا تھا۔ سید سلیمان ندوی نے یہ سفرنامہ رسالہ ''معارف'' کے لیے تحریر کیا تھا، جس میں یہ قسط وار شائع ہوا۔ بعد میں اس سفرنامے کو کتابی شکل میں ۱۹۴۵ء کو نفیس اکیڈمی، حیدرآباد (دکن) سے شائع کیا گیا۔ یہ سفر تعلیمی نوعیت کا تھا جس میں فرمانروائے کابل نے تعلیمی اصطلاحات کے عمل کو تیز کرنے کی غرض سے ان تینوں حضرات کو مشورے کے لیے طلب کیا تھا۔ دراصل یہ سفرنامہ صرف چار دن کے قیامِ افغانستان کی روداد ہے، جس کو سید سلیمان ندوی نے اس خوبی سے قلمبند کیا ہے کہ ایک پورا عہد اس میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔

سفرنامہ مصر، فلسطین وشام وحجاز (خواجہ حسن نظامی):

خواجہ حسن نظامی اردو زبان کے بہترین انشاء پرداز، صحافی، ہندو مسلم یک جہتی کے علمبردار، جنگ آزادی کے نقیب اور ایک صوفی منش سیاح تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے پانچ سے زیادہ سفرنامے لکھے اور ان سفرناموں کو لکھنے کے لیے انھیں کئی مشرقی ممالک اور ہندوستان کے کئی علاقوں کا سفر کرنا پڑا۔ خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۰۷ء میں بمبئی، گجرات اور کاٹھیاواڑ کا سفر کیا اور اس سفرنامے کا نام ''سفر ہندوستان'' رکھا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا ایک اور سفرنامہ ''سیر دہلی'' ہے۔ دراصل ''سیر دہلی'' اور ''سیر ہندوستان'' دونوں سفرنامے کے فن پر کھرا نہیں اترتے ہیں۔ سفرنامہ ''سیر دہلی'' کتابچہ یا ٹورسٹ گائڈ کی شکل میں تحریر کیا گیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے درج بالا سفر ناموں کو روایتی انداز میں معلومات پہنچانے کی غرض سے تحریر کیا لیکن اردو ادب میں ان کے صرف دو سفر ناموں کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ان کا پہلا اہم سفر نامہ ''سفر نامہ مصر، فلسطین و شام وحجاز'' اور دوسرا ''سفر نامہ افغانستان'' ہے۔ یہ دونوں سفر نامے اصول وضوابط کے لحاظ سے تحریر کیے گئے ہیں۔خواجہ حسن نظامی نے ان دونوں سفر ناموں اور اس کی ہئیت میں مختلف النوع تجربات بھی کیے ہیں۔خواجہ حسن نظامی ۱۹۱۱ء کو آسٹرین کمپنی کے جہاز سے سفر پر روانہ ہوئے۔انہوں نے اپنے سفر میں بیت المقدس، رملہ، فلسطین اور مصر کی سیر کی۔

''سفر نامہ افغانستان'' خواجہ حسن نظامی کا ایک یادگار سفر نامہ ہے۔وہ ۱۵؍ستمبر ۱۹۳۱ء کو افغانستان کے مزارات کی زیارت کے لیے نکلے اور ۱۴؍اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستان واپس پہنچے۔اس سفر نامہ میں انہوں نے افغانستان کی جغرافیائی تاریخ، سیاسی، سماجی حالات اور خاص طور پر بزرگانِ دین کے حالات سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔اس سفر نامے کو پہلے انہوں نے روزنامچہ کی شکل میں قلمبند کیا بعد میں مکمل سفر نامے کی شکل میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اس سفر نامے میں شاہ افغانستان غازی محمد نادر شاہ کے سفر نامے کے اردو ترجمہ کو بھی شامل کیا ہے۔اس کے علاوہ اپنے سفر ناموں میں خواجہ حسن نظامی نے بار بار شبلی نعمانی کے سفر نامے کا بھی حوالہ دیا ہے۔''سفر نامہ افغانستان'' میں خواجہ حسن نظامی نے افغانی قوم، سماجی رسم ورواج، روزمرہ کے معمولات، اخلاق وعادات اور دیگر حالات کا ذکر کیا ہے۔خواجہ حسن نظامی نے اس سفر نامے میں افغانستان کے تقریباً اہم مقامات کی سیر کی جن میں کابل، غزنی اور قندھار وغیرہ شامل ہیں۔

مسافر کی ڈائری (خواجہ احمد عباس):

خواجہ احمد عباس نے ۱۹۳۸ء میں ورلڈ یوتھ کانفرنس نیویارک میں شرکت کے لیے سفر کیا۔اس سفر کے دوران انہوں نے سترہ ملکوں کی سیر کی اور اس کی تفصیل کو اپنے سفر نامے ''مسافر کی ڈائری'' میں پیش کیا ہے۔یہ سفر نامہ ۱۹۴۰ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی سے شائع ہوا۔انہوں نے اپنے سفر کے پانچ مہینوں میں کولمبو، ہانگ کانگ، کنیڈا، لاس اینجلس، نیویارک، انگلستان، فرانس، ترکی، عراق اور ایران کی سیر کی اور دوران سفر انہیں جو بھی چیزیں نظر آئیں اسے ایک صحافی کی طرح ''مسافر کی ڈائری'' میں نوٹ کرلیا ہے۔

لندن سے آداب عرض (آغا محمد اشرف):

آغا محمد اشرف نے ۱۹۳۹ء میں لندن یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دینے کی غرض سے چار سال

قیام کیا۔اس چار سالہ قیام میں انہوں نے لندن کو بخوبی دیکھا اور اپنی تحریروں کے ذریعے اسے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔''لندن سے آداب عرض'' آغا محمد اشرف کے چند ایسے مضامین کا مجموعہ ہے، جو قیام لندن کے دوران ذہن پر طاری ہوئے۔اس مضامین کو انگلستانی تہذیب و معاشرت کے عنوان سے ریڈیو، بی بی سی لندن میں قسط وار پیش کیا گیا۔ یہ سفرنامہ ۱۹۷۶ء میں کتاب منزل، لاہور سے شائع ہوا۔

''دیس سے باہر'' آغا محمد اشرف کا دوسرا سفرنامہ ہے جس میں افریقہ، ایران اور سری لنکا کی روداد کو جذباتی انداز میں دلکش اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

یادوں کے سائے (عتیق صدیقی):

''یادوں کے سائے''، عتیق صدیقی کا مشہور سفرنامہ ہے، جو ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء تک عراق، ایران اور مصر کے حالات کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتا ہے۔ دراصل یہ سفرنامہ ۱۹۷۴ء میں مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی سے شائع ہوا لیکن اس سفرنامے میں جو واقعات درج کیے گئے ہیں وہ ۱۹۴۵ء تا ۱۹۴۷ء کے درمیان کے ہندوستان کے سیاسی حالات پر مبنی ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں جو سفرنامے قلمبند کیے گئے ان میں اگر چہ معلومات فراہم کرنے کا رجحان غالب ہے اور وہاں بھی ہر شے کو تاریخ و جغرافیہ کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔مگر اس دور کے سفرنامہ نگاروں نے اپنی ذات کو سفرنامے سے بالکل علیحدہ نہیں رکھا۔ وہ اپنی رائے اور پسند و ناپسند کا بھی برملا اور بے تکلف اظہار کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو نسبتاً زیادہ تر ادبی انداز میں پیش کرتے ہیں۔

یہ تمام وہ سفرنامے ہیں جو بیسویں صدی کے بالکل ابتدائی دہائیوں میں تحریر کیے گئے ہیں۔بیسویں صدی میں جب سفر کی سہولیات میسر آنے لگیں تو نہ صرف سفر کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ حالاتِ سفر بیان کرنے کا شوق بھی پروان چڑھا۔اسی دور میں بعض ایسے سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں جو اردو نثر اور غیر افسانوی ادب میں قیمتی اضافہ ہیں۔مثلاً خواجہ غلام الثقلین کا ''روزنامچہ سیاحت'' (۱۹۱۱)، مولوی محمد علی کشوری کا ''مشاہدات کابل و یاغستان'' (۱۹۱۸)، عطیہ فیضی کا ''زمانہ تحصیل''، شاہ بانو کا ''سیاحت سلطانی''، نواب فتح خان کا ''سیاحت فتح خانی''، محمد بدرالاسلام فضلی کا ''حقیقت جاپان''، نواب محمد ظہیر الدین کا ''سیاحت نامہ''، سر رضا علی کا ''اعمال نامہ''، ہارون خان شیروانی کا ''یورپ

جنگ سے پہلے''، پنڈت شونرائن شمیم کا ''سفر نامہ شمیم'' (۱۹۲۷)، الیاس بنی کا ''صراطِ حمد'' (۱۹۲۸)، ڈاکٹر محمد حسین کا ''افغانستان میں میرے اکیس برس'' (۱۹۲۹) اور شہباز حسین کا ''سفر نامہ عراق، عرب، عجم'' وغیرہ شائع ہوا۔ یہ سفر نامے اردو سفر نامہ کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

عروس نیل (سلطانہ آصف فیضی):

سلطانہ آصف فیضی نے اپنے شوہر کے ہمراہ ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۱ء تک کا عرصہ مصر میں بسر کیا۔ ان کے شوہر مصر میں سفارتی عہدے پر فائز تھے۔ سلطانہ آصف فیضی کا سفر نامہ ''عروس نیل'' ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا، جو بعد آزادی خواتین کے ذریعے تحریر کردہ پہلا سفر نامہ ہے۔ آصف فیضی نے مصر کی تہذیب اور رسم و رواج کا بغائر مشاہدہ کیا اور اپنے سفر نامے میں پیش کیا۔ اردو سفر نامے کی روایت میں ''عروس نیل'' کو اہمیت حاصل ہے کہ اس سفر نامے میں جدید رجحانات کو پیش کیا گیا ہے۔

ساحل اور سمندر (سید احتشام حسین):

''ساحل اور سمندر'' سید احتشام حسین کا واحد سفر نامہ ہے، جو انہوں نے ۱۹۵۴ء میں تحریر کیا ہے۔ احتشام حسین کے سفر کا آغاز جولائی ۱۹۵۲ء میں ہوا اور وہ تقریباً ایک سال بعد ۱۹۵۳ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔ اس سفر کی روداد کو انہوں نے ڈائری (روزنامچہ) کی تکنیک میں قلمبند کیا ہے۔ یہ سفر نامہ صرف امریکہ اور انگلستان کے سیر کے احوال پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف عنوانات کے چھ ابواب شامل ہیں۔

ڈھائی ہفتہ پاکستان میں (مولانا عبدالماجد دریا آبادی):

''سفر حجاز''، ''تاثرات دکن'' اور ''ڈھائی ہفتہ پاکستان میں'' عبدالماجد دریا آبادی کے مشہور سفر نامے ہیں۔ مولانا عبدالماجد کے دیگر سفر ناموں کے بالمقابل ''ڈھائی ہفتہ پاکستان میں'' انفرادیت لیے ہوئے اسے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جیسے کہ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا یہ سفر نامہ پاکستان کے ڈھائی ہفتے کے سیر کے احوال پر مبنی ہے۔ یہ سفر مولانا عبدالماجد نے ۱۹۵۵ء کے وسط میں کیا تھا۔

ترکی میں دو ہفتے (مولانا سید ابوالحسن ندوی):

مولانا سید ابوالحسن ندوی ایک معتبر عالمِ دین کی حیثیت سے پوری دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔عربی، فارسی اور اسلامی علوم پر مہارت حاصل ہونے کی وجہ سے انہیں ''علی میاں ندوی'' بھی کہا جاتا ہے۔عالمِ اسلامی کی ایک عظیم مذہبی شخصیت ہونے کی وجہ سے دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں انہیں کئی ممالک کے سفر در پیش تھے۔اسی دعوتی سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر علی میاں ندوی ۱۹۵۶ء میں دمشق یونیورسٹی میں مدعو تھے۔اس سفر کے دوران انہوں نے ترکی کی سیر کی اور وہاں کے حالات کو اپنے سفرنامے ''ترکی میں دو ہفتے'' میں پیش کیا ہے۔مولانا سید ابوالحسن ندوی نے ترکی میں قیام کے دوران قسطنطنیہ، قونیہ اور انگورہ جیسے بڑے شہروں کی سیاحت کی اور وہاں کے علمی وادبی مراکز سے رجوع کیا۔

مولانا علی میاں ندوی کا دوسرا سفرنامہ ''شرق اوسط میں کیا دیکھا'' مکتبہ تعلیمات اسلام نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا۔ جو دراصل مولانا ابوالحسن ندوی کے ریڈیو پر کی گئی عربی تقریر کا مجموعہ تھا، جسے مولوی مشیر الحق عابدی نے اردو میں ترجمہ کیا۔ان تقاریر میں قاہرہ اور دمشق کے سیاسی ،سماجی ، تاریخی اور جغرافیائی حالات کو قلمبند کیا ہے۔مولانا ابوالحسن ندوی کا مزید ایک سفرنامہ ''دریائے کابل سے دریائے یرموک تک''، مجلس تحقیقات نشریات اسلام ،لکھنؤ کے توسط سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ مغربی ایشیاء کے چھ مسلم اور عرب ممالک کے ایک دعوتی دورہ کی مفصل روداد ہے۔جس میں ان ممالک کی دینی ،فکری، سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کی سچی تصویریں ملتی ہیں۔

نظر نامہ (محمود نظامی):

آزادی کے بعد سفرناموں میں جدید روایت کو فروغ دینے کا سہرا محمود نظامی کے سفرنامہ ''نظر نامہ'' کو جاتا ہے۔اس لیے محمود نظامی کو جدید اردو سفرنامے کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔محمود نظامی نے اپنے سفر کا آغاز ۲۲/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو راولپنڈی سے کیا اور ۲۴/اپریل ۱۹۵۳ء کو مصر، لبنان، اٹلی ،سویٹزرلینڈ ،فرانس ، برطانیہ ،کنیڈا، جزائر بہاما، کیوبا اور ماسکو کا چکر کاٹ کر وہ اپنے ملک واپس ہوئے۔محمود نظامی کا یہ سفرنامہ بلاشبہ اردو سفرناموں کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔''نظر نامہ'' کے بعد اردو سفرنامہ میں جدید رجحانات کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔

سات سمندر پار (بیگم اختر ریاض الدین):

اردو سفرنامے کی روایت میں بیگم اختر ریاض الدین کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ وہ اردو کی پہلی خاتون ہیں، جنہوں نے اپنے سفرنامے کے ذریعے اس فن کو بلندیوں تک پہنچایا۔ ''سات سمندر پار'' اور ''دھنک پر قدم'' دونوں ان کے یادگار سفرنامے ہیں۔ ''سات سمندر پار'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اور ''سات سمندر پار'' کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے اردو مجلّہ ''ادبی دنیا'' لاہور میں قسط وار شائع ہوکر کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ اس سفرنامے میں دنیا کے چھ بڑے شہروں ٹوکیو، ماسکو، لینن گراڈ، قاہرہ، لندن اور نیویارک کے سفر کی تفصیل کو رنگینی اور لطافت کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔

''دھنک پر قدم'' بھی ان کے پہلے سفرنامے کی طرح ابتداء میں ''ادبی دنیا'' لاہور میں شائع ہوکر مقبول ہوا۔ اس سفرنامے پر بیگم اختر ریاض الدین کو ۱۹۶۹ء میں پاکستان رائٹرس گلڈ کے ''آدم جی ادبی انعام'' سے نوازا گیا۔

ارض پاک سے دیار فرنگ تک (عبادت بریلوی):

سید احتشام حسین کے بعد اردو کے نقاد عبادت بریلوی نے تحقیقی و تدریسی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر فرنگستان کا سفر کیا اور اس سفر کی روداد کو اپنے سفرنامے ''ارض پاک سے دیار فرنگ تک'' میں شائع کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ۱۹۶۲ء میں فرنگ کا سفر اختیار کیا۔ درس و تدریس کی خاطر عبادت بریلوی نے تقریباً پانچ سال تک لندن میں قیام کیا۔ عبادت بریلوی نے اپنے سفرنامے میں لندن کی تمام تفصیل کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے دوسرے سفرنامے ''ترکی میں دو سال'' کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

بجنگ آمد (کرنل محمد خان):

کرنل محمد خان نے دو سفرنامے ''بجنگ آمد'' اور ''بسلامت روی'' لکھی ہے۔ ''بجنگ آمد'' کرنل محمد خان کا پہلا سفرنامہ ہے، جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس سفرنامے میں انہوں نے ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء کے عرصے میں فلسطین، مصر، لیبیا اور برما کے سفر کی تفصیلات کو شامل کیا ہے۔ سفرنامہ ''بجنگ آمد'' کرنل محمد خان کی نیم لیفٹینی کی دلچسپ داستان ہے، جو برطانوی فوج میں ان کے کیڈٹ بننے سے شروع ہوکر رزم و بزم کی داستانوں کو شامل کرکے ۱۹۴۷ء کو اختتام تک پہنچتی ہے۔

اس سفرنامے میں فوجی زندگی کے روزمرہ کی معمولات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

''بسلامت روی'' کرنل محمد خاں کا دوسرا سفرنامہ ہے۔کرنل محمد خاں نے یورپ، ترکی اور لبنان کا سفر ۱۹۶۶ء میں حکومتِ برطانیہ کی تعلیمی دعوت پر کیا تھا۔کرنل محمد خاں ''بسلامت روی'' کو سفرنامہ نہیں بلکہ آدمی نامہ اور حلقہ یاراں میں ایک یار کی داستان طرازی کہتے ہیں۔اس سفرنامے میں انہوں نے سویٹزرلینڈ، انگلستان، فرانس، جرمنی اور دیگر ممالک کی تمدنی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے۔

ابن انشاء کے سفرنامے:

ابن انشاء نے کل پانچ سفرنامے لکھے جن میں ''چلتے ہو تو چین کو چلیے''، ''دنیا گول ہے''، ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں''، ''نگری نگری پھرا مسافر'' اور ''آوارہ گرد کی ڈائری'' شامل ہیں۔ان کا پہلا سفرنامہ ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے روزنامچہ ''جنگ'' میں شائع ہوا۔یہ سفرنامہ پہلی بار کتابی شکل میں لاہور اکیڈمی سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ابن انشاء کے چین کا سفر سرکاری نوعیت کا تھا۔انہوں نے یہ سفر اپریل ۱۹۶۶ء میں کیا تھا۔اس سفرنامے کو ابن انشاء نے صحافتی ضرورت کے لیے کالم کی نوعیت میں لکھا تھا، جس نے بعد میں مربوط سفرنامے کی شکل اختیار کر لی۔

ابن انشاء کا دوسرا سفرنامہ ''آوارہ گرد کی ڈائری'' ہے، جو ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔چین کے سفر کے بعد ہی ۱۹۶۷ء میں UNESCO کی جانب سے ابن انشاء کو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں یورپ کے کئی ممالک کے ساتھ قاہرہ، لبنان اور شام بھیجا گیا۔اس سفرنامے میں ابن انشاء نے یورپ کے معاشرے کی عکاسی تفصیل کے ساتھ کی ہے۔''دنیا گول ہے'' ابن انشاء کا طویل سفرنامہ ہے، جو ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے میں فلپائن، انڈونیشیا، سنگاپور، ملیشیا، بینکاک، ہانگ کانگ اور افغانستان وغیرہ کی سیر کا احوال درج کیا گیا ہے۔

''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' ابن انشاء کا آخری سفرنامہ ہے، جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔یہ سفرنامہ بھی ابن انشاء کے دیگر سفرناموں کی طرح بہت دلچسپ ہے۔اس سفرنامے کا نام ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' محض برائے مزاح ہے، کیونکہ ابن بطوطہ اپنے سیاحت کے دوران فرینکفرٹ اور جرمنی نہیں گئے تھے۔جبکہ ابن انشاء نے اپنے اس سفرنامے میں ٹوکیو، ہانگ کانگ، جاپان، جرمنی اور لندن کی سیر کے احوال کو بھی قلمبند کیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے:

بلاشبہ مستنصر حسین تارڑ اردو سفر نامہ نگاروں کے قافلے کا میرِ کارواں ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ناول، ڈرامے اور ادب کی دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن جو شہرت انہیں سفر نامہ نگاری میں حاصل ہوئی وہ اردو کے دیگر اصناف میں حاصل نہیں ہو سکی۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے نوجوان طبقے کو اردو ادب کے مطالعے کی طرف پھر سے راغب کیا ہے۔ مستنصر حسین نے بیس سے زیادہ سفر نامے تحریر کیے اور ان کے تقریباً سبھی سفر ناموں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے آج اردو ادب میں بیسٹ سیلر کا درجہ رکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے سفر ناموں کو پڑھنے والوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر تحریر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے آج تارڑ کے سفر نامے ایک وسیع حلقے میں پڑھے جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے اندرون اور بیرون ملک کے سفر ناموں کی تعداد تیئیس (۲۳) ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ذریعے تحریر کردہ سفر ناموں کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

(۱) نکلے تیری تلاش میں ۱۹۷۱ء (۲) اُندلس میں اجنبی ۱۹۷۵ء (۳) خانہ بدوش ۱۹۷۸ء (۴) ہُنزہ داستان ۱۹۸۵ء (۵) سفر شمال کے ۱۹۸۷ء (۶) نانگا پربت ۱۹۹۱ء (۷) کے ٹو کہانی ۱۹۹۳ء (۸) چترال داستان ۱۹۹۴ء (۹) یاک سرائے ۱۹۹۷ء (۱۰) نیپال نگری ۱۹۹۸ء (۱۱) پُتلی پیکنگ کی ۲۰۰۰ء (۱۲) شمشال بے مثال ۲۰۰۰ء (۱۳) سنو لیک ۲۰۰۰ء (۱۴) سنہری اُلّو کا شہر ۲۰۰۱ء (۱۵) دیو سائی ۲۰۰۲ء (۱۶) برفیلی بلندیاں ۲۰۰۴ء (۱۷) مُنہ وَل کعبے شریف ۲۰۰۴ء (۱۸) غارِ حرا میں ایک رات ۲۰۰۴ء (۱۹) رتّی گلی ۲۰۰۶ء (۲۰) ماسکو کی سفید راتیں ۲۰۰۸ء (۲۱) نیویارک کے سو رنگ ۲۰۰۹ء (۲۲) الاسکا ہائی وے ۲۰۱۱ء (۲۳) ہیلو ہالینڈ ۲۰۱۱ء وغیرہ۔

''نکلے تیری تلاش میں'' مستنصر حسین تارڑ کا پہلا باقاعدہ سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ ابتداء میں ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں قسط وار شائع ہوا، جو بعد میں ۱۹۷۱ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ ۴۸۸ر صفحات پر مشتمل ضخیم سفر نامہ ہے، جسے ۲۸ر ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں مذہبی تہذیب وتمدن کو زندگی کے روزمرہ کے معمولات سے جوڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس سفر نامے میں سترہ ملکوں کی سیر کے احوال کو درج کیا گیا ہے، جس میں یورپ کے علاوہ کئی دوسرے مسلم ممالک کی سیر کا احوال موجود ہے۔

دنیا میرے آگے (جمیل الدین عالؔی):

جمیل الدین عالی صرف اردو غزل، دوہے اور کالم نویسی کا ہی اہم نام نہیں ہیں بلکہ اردو سفرنامے کا بھی ایک اہم نام ہیں۔انہوں نے اپنے دونوں سفرناموں ''دنیا میرے آگے'' اور ''تماشا میرے آگے'' کے ذریعے اردو سفرنامہ کی روایت میں اہم اضافہ کیا ہے۔اب تک ان کے پہلے سفرنامے ''دنیا میرے آگے'' کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں جوان کے سفرنامے کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ء، دوسری مرتبہ ۱۹۸۴ء اور تیسری مرتبہ ۱۹۹۱ء میں غلام علی پرنٹرز، لاہور سے شائع ہوا۔جمیل الدین عالی نے مختلف ممالک کا سفر کیا اور ان کا احوال اپنے سفرناموں میں قلمبند کیا ہے۔سفرنامہ ''دنیا میرے آگے'' میں انگلستان، فرانس اور روس کے علاوہ ایران، عراق، لبنان اور مصر کے اسفار کی تفصیل موجود ہے۔اس سفرنامے کی روداد بھی اردو کے دیگر سفرناموں کی طرح ابتداء میں اخباری کالم میں شائع ہوا، جسے اردو کے قارئین نے بہت پسند کیا اور بعد میں جمیل الدین عالی نے اسے سفرنامے کی صورت میں شائع کیا۔

دجلہ (شفیق الرحمٰن):

سفرنامے کی روایت میں شفیق الرحمٰن ایک اہم نام ہے۔سفیق الرحمٰن کا منفرد اور جدید تکنیک سے لیس سفرنامہ ''دجلہ'' ہے۔جس میں مصر، جرمنی اور عراق کے سفر کا احوال درج ہے۔اس سفرنامے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں انہوں نے تخیل کی آمیزش سے اور افسانوی کرداروں کے ذریعے مزاحیہ اسلوب کو پیش کیا ہے۔یہ سفرنامہ اردو ادب کے دیگر سفرناموں سے یکسر مختلف ہے۔اس میں انسانوں کے جذبات اور ماضی کی بازیافت پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہیں کہیں فلیش بیک (Flash Back) اور فلیش فارورڈ (Flash Farword) کی تکنیک بھی استعمال کی گئی ہے۔شفیق الرحمٰن نے اس سفرنامے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔جن میں ''نیل''، ''دھند''، ''دینوب'' اور ''دجلہ'' شامل ہیں۔یہ سفرنامہ ۴۴۸ رصفحات پر مشتمل ہے جو غالب پبلشرز، لاہور سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے میں شفیق الرحمٰن نے اپنے جذبات وخیالات کو پیش کرنے کے علاوہ عورتوں کی نفسیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

سفر نصیب (مختار مسعود):

مختار مسعود اپنی دلکش نثر اور منفرد اسلوب کی وجہ سے اردو نثر نگاروں میں ایک انفرادی مقام پر فائز ہیں۔مختار

مسعود کو اپنی تصانیف ''آوازِ دوست''، ''لوح ایام'' اور ''سفر نصیب'' کی وجہ سے اردو حلقے میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ''سفر نصیب'' اردو کے روایتی سفرناموں سے حد درجہ مختلف ہے۔ اس کتاب کو مختار مسعود نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا حصہ سفری داستان اور دوسرا خاکہ ہے۔ اس سفرنامے میں انہوں نے ۱۹۴۰ء کے بعد جنگ عظیم کے پس منظر میں یورپی ممالک کا احاطہ کیا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پس منظر میں تقسیمِ وطن کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس طرح اس سفرنامے میں ۱۹۴۰ء تا ۱۹۸۰ء تک کے حالات کا تجزیہ شامل ہے۔ مختار مسعود نے اپنے سفرنامے کی ابتدا ''برف کدہ'' کے عنوان سے کی ہے۔ وہ مسافر کا جائزہ طائرانہ نظروں سے لیتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے جملے میں کئی معنیٰ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ اس سفرنامے میں انہوں نے تربیلا، سوات اور سری لنکا کے ایک پہاڑی مقام پرادانیہ اور دیگر یورپی ممالک کی سیر کے احوال کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ مختار مسعود کا یہ سفرنامہ اپنے اسلوب کی دلکشی اور منفرد لہجے کی وجہ سے اردو کا ایک اہم سفرنامہ ثابت ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد کے سفرناموں نے ہی دراصل جدید سفرناموں کے لیے اساسی کردار ادا کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکیسویں صدی آتے آتے سفرناموں کے موضوع، تکنیک اور ہیئت میں تبدیلی آنے لگی تھی لیکن اس کی شروعات تقسیم کے بعد کے تقریباً ۲۵، ۳۰ سال بعد کے سفرناموں سے ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد اردو میں تحریر کردہ سفرناموں میں ڈاکٹر محمد باقر کا سفرنامہ ''لاہور سے لندن تک'' اور ''چھ مہینے ایران میں''، قیوم نظر کا ''پیرس سے روم تک''، ابراہیم جلیس کا ''نئی دیوار چین''، ڈاکٹر وحید قریشی کا ''چین کی حقیقتیں اور افسانے''، عطاء الحق قاسمی کا ''شوق آوارگی'' سید عابد حسین کا ''رہ نورد شوق''، شکیل الرحمٰن کا ''قصہ میرے سفر کا''، بریگیڈئر گلزار احمد کا ''تذکرہ انگلستان'' اور ''تذکرہ چین''، حاجی حیدر علی خان کا ''دنیا کی سیر'' محمد اقبال انصاری کا ''نیل سے فرات تک''، صبا لکھنوی کا ''میرے خوابوں کی زمین مشرقی پاکستان''، ڈاکٹر منظور مختار کا ''ارض وخیام و حافظ''، طفیل احمد کا ''ماسکو میں اٹھائیس گھنٹے''، شاہ محمد عزیز کا ''رائیل پور سے ماسکو تک''، طفیل احمد جمالی کا ''سفر ماسکو''، خلیل احمد حامدی کا ''ترکی قدیم وجدید''، جمیل صبا کا ''سفر ہے شرط''، وجاہت حسین کا ''جب میں نے کویت دیکھا'' اور ذالفقار احمد تابش کا ''جزیرہ'' وغیرہ اہم سفرنامے ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں بے شمار سفرنامے لکھے گئے جو اردو سفرنامے کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ لیکن راقم کی ان تک رسائی نہیں ہوسکی۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کے بعد سے ۱۹۸۰ء تک اردو سفرناموں کی اشاعت میں

خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

آزادی کے بعد سے ۱۹۸۰ء تک اردو میں تقریباً پچاسوں سفرنامے لکھے گئے بعض سفرنامہ نگاروں نے سفرنامے کے روایت کی پاسداری کی تو بعض سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفرناموں میں جدّت کو برتا ہے۔اردو کے کئی ادبا وشعرا نے بیرونی مما لک کے سفر کیے، اوراپنے اس سفر کی روداد کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔

دورِ حاضر میں دنیا کے ہر شعبے سے تیز رفتار ترقی عمل میں آرہی ہے، جس کی وجہ سے آمدورفت کے وسائل میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔ابتداء میں بیرونی مما لک کا سفر کرنا ہو تو سمندری جہاز کے علاوہ دیگر مسائل میسر نہیں تھے لیکن بیسویں صدی نصف سے ہندستان اور ایشیاء کے دیگر پسماندہ مما لک میں بھی ہوائی خدمات عام ہو گئیں۔آزادی کے بعد سے ہندستان میں ہوائی سفر کے اخراجات ہر کس وناکس کے بس میں تھے، جس کی وجہ سے بیرونی مما لک کا سفر کرنے کا رجحان عام ہوا۔جدید دور میں اردو سفرنامہ نگار نے سفرنامے کو فکشن کی حد میں داخل کر دیا ہے۔انہوں نے مقامات سیاحت کو اپنی باطن کی آنکھ سے دیکھا اور دل کی زبان سے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔

اک دیس اک بدیسی (کلیم عاجز):

کلیم عاجز کو اپنی شاعری کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی لیکن وہ اردو کے بہترین نثر نگار بھی ہیں۔ان کے کئی سفرنامے شائع ہو چکے ہیں، جن میں اندرونِ وطن کی سیر پر چھ مختصر سفرنامے اور اس کے علاوہ دوسرا حج کی یادداشتوں پر مبنی سفرنامہ ''یہاں سے کعبہ اور کعبہ سے مدینہ'' شامل ہے۔''اک دیس اک بدیسی'' کلیم عاجز کا سفرنامہ امریکہ ہے، جو ۱۹۸۱ء میں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا۔یہ سفرنامہ ۱۹۸/صفحات پر مشتمل ہے۔کلیم عاجز کا سفرنامہ ''اک دیس اک بدیسی'' اپنے مقاصد کے لحاظ سے اردو کے دیگر سفرناموں سے یکسر مختلف ہے۔اس سفرنامے میں کلیم عاجز کی توجہ کا مرکز برصغیر ہندو پاک کے مسلمان اور امریکہ میں اسلام کی صورتِ حال ہے۔کلیم عاجز نے امریکہ میں تقریباً ڈھائی مہینہ قیام کیا۔انہوں نے سیر کے دوران ہر اسلامی مراکز اور روایات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

سفر زندگی کے لیے سوز وساز (صالحہ عابد حسین):

''سفر زندگی کے لیے سوز وساز'' صالحہ عابد حسین کے کئی اسفار کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے شادی کے بعد اپنے شوہر عابد حسین و دیگر رشتہ داروں کی رفاقت میں کی تھیں۔اس سفرنامے میں صالحہ عابد حسین کی ازدواجی زندگی کی حسین

یادیں بھی شامل ہوگئی ہیں۔صالحہ عابد حسین اس سفرنامے کو اپنی خودنوشت سوانح کا ایک حصہ مانتی ہیں ۔ یہ سفرنامہ ہندوستان کے مختلف سیاحتی مقامات چند یورپی ممالک اور مکہ و مدینہ کی زیارت پر مشتمل ہے۔انہوں نے مختلف تقاریب میں شرکت کی غرض سے اپنے عزیز و اقارب اور شوہر کے ساتھ ہندوستان کے خاصے بڑے حصے کی سیر و تفریح کی اور اس کا ذکر اپنے سفرنامے میں ''ہندوستان جنت نشان'' کے عنوان کے تحت کیا ہے۔اس کے علاوہ بہت سے پہاڑی مقامات شمالی و جنوبی ہند بطور خاص حیدرآباد، اورنگ آباد، پونا، مہابلیشور، بنگلور اور میسور جیسے مقامات کی بھی انہوں نے جی بھر کے سیر کی اور اسی سیر کے احوال کو اپنے سفرنامے ''سفر زندگی کے لیے سوز و ساز'' میں درج کیا ہے۔

صالحہ عابد حسین نے ۱۹۵۳ء میں اپنے شوہر کے ساتھ دیارِ مغرب کا سفر کیا، جس کا ذکر انہوں نے اپنے سفرنامے ''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے'' کے عنوان سے کیا ہے۔اس حصے میں انگلستان، پیرس، سویٹزرلینڈ، اٹلی اور جرمنی کے سفر کی روداد موجود ہے۔صالحہ عابد حسین کے غیر ممالک کا آخری سفر حج و زیارت پر مبنی ہے۔غالباً یہ سفر انہوں نے ۱۹۷۰ء کے بعد کیا ہے۔اس سفرنامے میں انہوں نے حجِ اکبر کے روح پرور مناظر اور مدینہ منوّرہ کی روح پرور فضاء کو بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔اس طرح انہوں نے اپنی زندگی میں نہ صرف ہندوستان کے تمام اہم مقامات مقدسہ اور یورپی ممالک کی سیاحت کی بلکہ اس سیر کے احوال پر ایک خوبصورت سفرنامہ بھی ۱۹۸۲ء میں شائع کروایا۔اس سفرنامے میں صالحہ عابد حسین کے ۱۹۳۶ء تا ۱۹۷۰ء تک کے کئی سیر و سیاحتوں کی دلچسپ تفصیل موجود ہے۔

صالحہ عابد حسین نے ۱۹۶۲ء میں اپنے بھائی کے ساتھ ایران و عراق کے مقامات مقدسہ کی بھی زیارت کی اور وہاں پر تقریباً ایک مہینہ قیام کیا۔صالحہ عابد حسین کا ماننا ہے کہ ایران و عراق کا مہینے بھر کا سفر ان کی زندگی کی بہترین یادوں میں سے ہے۔ان یادوں کو انہوں نے اپنے سفرنامے میں بڑے جذباتی انداز میں ''ائمہ معصومین کے دربار میں'' کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ ''سفر زندگی کے لیے سوز و ساز'' اردو ادب کا ایک اہم سفرنامہ ہے، جس میں صالحہ عابد حسین نے اپنی زندگی کے طویل عرصے میں کیے گئے اسفار کی روداد کو شوق کی فراوانی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔

سفر آشنا (گوپی چند نارنگ):

گوپی چند نارنگ عصرِ حاضر کے ایک بڑے نقاد اور ماہرِ لسانیات ہیں۔گوپی چند نارنگ نے ۱۹۸۱ء میں جرمنی،

امریکہ، انگلستان اور اسکینڈے یونین ملکوں کی سیر کی اور اسی سیر کی تفصیل کو ''سفر آشنا'' کے نام سے لکھ کر ۱۹۸۲ء میں ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع کروایا۔ ''سفر آشنا'' گوپی چند نارنگ کا مختصر سفر نامہ ہے، جسے انہوں نے پانچ ابواب میں رقم کیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''سیل سفر'' رکھا، جس میں انہوں نے فرینکفرٹ اور مغربی جرمنی کی سیر کا احوال درج کیا ہے۔ دوسرا باب ''شجرہ سایہ دار'' ہے، جس میں لندن اور واشنگٹن کی تفصیل ہے۔ تیسرا باب ''بہ ہر سو رقص بسمل'' ہے۔ چوتھا باب ''منزل منزل عشق و جنون'' ہے، جس میں اوسلو اور ناروے کی تفصیل ہے اور آخری باب ''تبسمِ گل فرصت بہار'' ہے۔ گوپی چند نارنگ نے بیرونی ممالک کا سفر ادبی تقریبات میں حصہ لینے کی غرض سے کیا تھا، جس کی وجہ سے اس سفر نامے میں ادبی شخصیات اور ادبی تقریبات کا بیان زیادہ ہے۔

خواب خواب سفر (رام لعل):

رام لعل نے دو سفر نامے لکھے ہیں۔ رام لعل کا پہلا سفر نامہ ''خواب خواب سفر'' اور دوسرا سفر نامہ ''زرد پتوں کی بہار'' ہے، جو انہوں نے ۱۹۸۰ء میں اپنی جنم بھومی پاکستان کی سیر کرنے کے بعد تحریر کیا ہے۔ رام لعل نے ۱۹۷۸ء میں اپنے دوست چرن چاولہ کی دعوت پر سویڈن، ڈنمارک اور دیگر اسکینڈے یونین ملکوں کی سیر کی اور اسی سیر کی روداد کو ''خواب خواب سفر'' کے عنوان سے ۱۹۸۳ء میں شائع کروایا۔

''زرد پتوں کی بہار'' رام لعل کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ یہ سفر انہوں نے ۱۹۸۰ء میں کیا تھا۔ رام لعل تقسیمِ وطن کے حادثے سے دوچار رہے ہیں اور تقریباً تیس برس بعد انہوں نے پاکستان کا سفر کیا اور اسی سفر کی روداد کو انہوں نے اس سفر نامے میں پیش کیا ہے۔

جاپان چلو جاپان چلو (مجتبیٰ حسین):

مجتبیٰ حسین اردو کے بڑے مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ ان کا سفر نامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' غیر معمولی مقبولیت کا حامل ہے۔ مجتبیٰ حسین نے ۱۹۸۰ء کے اواخر میں جاپان کا سفر کیا، جو ان کا بیرون ملک کا پہلا سفر تھا۔ اس سفر کے لیے یونیسکو کی جانب سے ٹوکیو میں منعقد پبلشنگ کورس میں شرکت کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ سفر سے واپسی کے بعد انہوں نے اپنا سفر نامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' کے نام سے تحریر کیا جو ۱۹۸۳ء میں حسامی بکڈ پو، حیدر آباد سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ مجتبیٰ حسین نے اس سفر نامے کو اپنے جاپان جانے کی تیاری سے لے کر حرف آخر تک

۳۵؍روزہ روداد سفر کو تقریباً ۱۵؍ابواب میں تقسیم کیا ہے۔اس سفرنامے میں مجتبیٰ حسین نے جاپان کی تہذیب، صنعتی اور سماجی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے قیام کی تفصیل کو بھی بیان کیا ہے۔

سفرنامہ ''جاپان چلو جاپان چلو'' کی غیر معمولی مقبولیت کے باوجود مجتبیٰ حسین نے جلدی کوئی سفرنامہ نہیں لکھا۔ حالانکہ انہوں نے جاپان کے سفر کے بعد مسلسل کئی ممالک کے سفر کیے۔کافی وقفہ کے بعد مجتبیٰ حسین کے دیگر سفرنامے قارئین کے سامنے آئے جس میں ''سفر لخت لخت'' اور ''امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے'' شامل ہیں۔دراصل یہ تمام سفر کے مضامین ہیں جس میں مسافر نوازی اور یادوں کی بے تکلف محفل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس طرح ہم ''سفر لخت لخت'' کو مجتبیٰ حسین کا دوسرا سفرنامہ کہہ سکتے ہیں، جو ۱۹۹۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس سفرنامے میں مجتبیٰ حسین نے انگلستان، فرانس، امریکہ، سویت یونین، تاشقند، سمرقند اور بخارا وغیرہ کے سیر کی تفصیل کو اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے۔

''امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے'' کی اشاعت ۲۰۰۹ء کو عمل میں آئی۔اس کے مرتب احسان اللہ احمد ہیں جو مجتبیٰ حسین کے ناقابلِ علاج مداح تھے۔اس کتاب میں مجتبیٰ حسین کے سفرنامے اور امریکہ کے بارے میں تحریر کیے گئے کالموں کا انتخاب ہے۔اس سفرنامے میں مجتبیٰ حسین کے امریکی سفر کی یادگار چند مضامین شامل ہیں جس میں ''امریکہ میں دیسی شادی''، ''نگری نگری پھرا مسافر'' اور ''ٹورنٹو میں تین دن'' بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

لندن اولندن (سید محمد عقیل رضوی):

جدید اردو سفرنامہ نگاروں میں سید محمد عقیل رضوی کا نام بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔سید محمد عقیل رضوی کا سفرنامہ ''لندن اولندن'' لندن اور پیرس کی روداد پر مشتمل ہے۔انہوں نے لندن کا سفر ترقی پسندوں کی ''گولڈن جبلی تقریب'' میں شریک ہونے کے لیے ۱۹۸۵ء میں کیا تھا۔سفرنامہ ''لندن اولندن'' کتابی شکل میں ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔''لندن اولندن'' میں صرف لندن اور پیرس کی تاریخ کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ وہاں کی تہذیب اور معاشرت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

ہند یاترا (ممتاز مفتی):

ممتاز مفتی اردو کے ایک منفرد ناول نگار اور سفرنامہ نگار ہیں۔ممتاز مفتی کے سفرنامہ ''ہند یاترا'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔''لبیک'' بھی ممتاز مفتی کا سفرنامہ حج ہے جسے بعض لوگ رپورتاژ مانتے ہیں۔ممتاز مفتی کی تصنیف

''لبیک'' کافی متنازعہ رہی بعض لوگوں نے اسے بہت پسند کیا تو بعض نے یکسر رد کر دیا لیکن ''ہندیاترا'' ممتاز مفتی کا بہترین سفرنامہ ہے، جس میں انہوں نے حقیقت نگاری اور رومان پسندی کے ساتھ نفسیاتی پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے۔ سفرنامہ ''ہندیاترا'' میں ممتاز مفتی نے ہندوستان کے ماضی کو عینک سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔اس سفرنامے میں باربار فلیش بیک کی تکنیک کا سہارا لیا گیا ہے۔اس سفرنامے کو ممتاز مفتی نے ۱۷/ابواب میں مختلف عنوانات کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ممتاز مفتی کا سفرنامہ ''ہندیاترا'' اظہار سنز، لاہور سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

کولمبس کے دیس میں (جگن ناتھ آزاد):

جگن ناتھ آزاد اردو کے مشہور شاعر اور ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔مشاعروں میں شرکت کی غرض سے اور اردو زبان کے شعرا و ادبا سے ملاقات کی غرض سے انہوں نے بیرون ہند اور اندرون ہند کے کئی مقامات کی سیر کی۔جگن ناتھ آزاد کا پہلا سفرنامہ ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' کے عنوان سے ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔اس کے بعد انہوں نے کئی بیرونی ممالک کے سفر کیے لیکن عرصے بعد ان کا دوسرا سفرنامہ ''پشکن کے دیس میں'' دسمبر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔ ''کولمبس کے دیس میں'' جگن ناتھ آزاد کا تیسرا اور اہم سفرنامہ ہے، جو ۱۹۸۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ان کے ابتدائی دو سفرنامے قدر مختصر ہیں لیکن ''کولمبس کے دیس'' میں ان کے دیگر سفرناموں کے بالمقابل طویل ہے۔جگن ناتھ آزاد نے ڈاکٹر خورشیدا ے ملک اور محمد وصی اللہ خاں چانسلر ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو کی دعوت پر امریکہ کا سفر کیا تھا اور اس سفر کی یادوں کو انہوں نے اپنے سفرنامے ''کولمبس کے دیس میں'' پیش کیا ہے۔جگن ناتھ آزاد نے اس سفرنامے میں امریکہ، کنیڈا اور برطانیہ میں چند ماہ قیام کی تفصیل کو پیش کیا ہے۔

اے آبِ رودِ گنگا (محمد رفیق ڈوگر):

محمد رفیق ڈوگر اپنے وقت کے مشہور ماہرِ اسلامیات، صحافی اور سفرنامہ نگار ہے۔انہوں نے اپنی زندگی میں سیاسی صورتِ حال سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے کئی دورے کیے، سفر کی یادگار کو اپنے سفرناموں میں قلمبند کیا ہے۔رفیق ڈوگر نے تقریباً سات سفرنامے لکھے ہیں۔ ''اے آبِ رودِ گنگا'' رفیق ڈوگر کا پہلا سفرنامہ ہے، جس میں ہندوستان کو ایک صحافی کی نگاہ سے تلاش کیا ہے۔سفرنامہ ''اے آبِ رودِ گنگا'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے کے علاوہ محمد رفیق ڈوگر نے ''اندلس کی تلاش''، ''جاپان نورد'' اور ''نیل بہتا رہا'' جیسے

سفرنامے لکھے جنھیں ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا۔عمومی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''اے آبِ رودِ گنگا'' اردو سفرناموں کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہے۔

آوارگی (جاوید دانش):

جاوید دانش ہمہ جہت شخصیت کے حامل ادیب ہیں۔ڈرامہ نگاری،ترجمہ نگاری اور سفرنامہ نگاری ان کی ادبی شخصیت کے چند پہلو ہیں۔جاوید دانش نے کئی سفرنامے لکھے جن میں '' آوارگی'' اور ''مزید آوارگی'' کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔سفرنامہ '' آوارگی'' ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے میں انہوں نے جرمنی،فرانس،انگلستان اورامریکہ کی سیر کے احوال کوقلمبند کیا ہے۔انہوں نے ان ممالک کا سفر ۱۹۸۲ء میں کیا تھا۔یہ سفرنامہ ابتداء میں ''اخبار مشرق'' کلکتہ کے سنڈے ایڈیشن میں تقریباً ۲۳رقسطوں میں شائع ہوا۔'' آوارگی'' جاوید دانش کا مقبول سفرنامہ ہے، جس میں وہ مناظر ومظاہر سے بے تکلف نظر آتے ہیں۔

جاوید دانش کا دوسرا سفرنامہ ''مزید آوارگی'' ہے جو جاپان، ہانگ کانگ اور بینکاک کی رودادِ سفر کا احاطہ کرتا ہے۔انہوں نے یہ سفر ۱۹۸۹ء میں کیا تھا۔یہ سفرنامہ ۱۹۹۴ء میں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آیا، جو ۲۵۴رصفحات اور ۲۴ر ابواب پر مشتمل ہے۔

وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے:سفرنامہ دکن (مرزا ظفرالحسن):

''وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے: سفرنامہ دکن'' اردو کا ایک ایسا سفرنامہ ہے،جس میں اپنے وطن کی مٹی سے محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس سفرنامہ میں انہوں نے اپنی دیرینہ یادوں کو تازہ کیا ہے۔ظفرالحسن نے سفرنامے کی ابتداء میں ''جگ ہنسائیاں کیا کیا'' کے تحت اپنے حالات اور پاکستان میں قیام اور دوست واحباب سے رخصت ہونے کے منظر کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔دوسرے حصے میں ''چاہا ہے اسی طرح سے لیلائے دکن کو'' کے تحت دکن سے وابستہ ماضی کی یادوں کو پیش کیا ہے۔غرض کہ یہ سفرنامہ ظفرالحسن کا یادداشتی سفرنامہ دکن ہے۔جس میں سفرنامہ نگار کے خلوص اور اپنے وطن حیدرآباد سے محبت کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جسے انہوں نے دلکش اور جذباتی اسلوب میں قلمبند کیا ہے۔ظفرالحسن نے اپنا سفرنامہ ''وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے'' کے عنوان سے ۱۹۸۵ء میں مکتبہ اسلوب،کراچی سے شائع کیا۔

آجاؤافریقہ (کشورناہید):

کشورناہید نے ۱۹۸۵ء میں عورتوں کے غیرسرکاری اداروں کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے افریقہ کا سفر کیا تھا۔افریقہ میں اپنے سولہ روزہ قیام میں انہوں نے مختلف طبقوں اور ملکوں کی بہت سی خواتین سے ملاقات کی اور اپنے سفری احوال کوسفرنامے ''آجاؤافریقہ'' میں قلمبند کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا،جس میں عورتوں کے سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔اس طرح یہ سفرنامہ تانیثیت Feminism کا نمائندہ سفرنامہ ہے۔

جرنیلی سڑک (رضاعلی عابدی):

رضا علی عابدی نے بی بی سی لندن کے شعبۂ اردو میں کئی برس اپنی خدمت انجام دیں ۔ریڈیو پر اردو پروگراموں کومقبول ومشہورکرنے میں انہوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔رضاعلی عابدی نے بی بی سی لندن اردوسلسلے وار پروگراموں کوکتابی صورت میں شائع کرنے کی ابتداء کی۔رضاعلی عابدی نے جن ریڈیائی دستاویز کوکتابی صورت میں شائع کیا ان میں ''جرنیلی سڑک''اور''شیر دریا'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔رضاعلی عابدی نے ۱۹۸۵ء میں گرینڈ ٹرنک روڈ کواپنا موضوع بنایااوراس پاک وہند کی تاریخی شاہراہ پرمسافراورمشاہداتِ نوکوریڈیو پرپیش کیااوروہی ریڈیائی دستاویز نے ''جرنیلی سڑک'' کی کتابی شکل اختیار کرلی۔رضاعلی عابدی کا سفرنامہ ''جرنیلی سڑک''۳۶/قسطوں میں ہے، جو ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔

''جہازی بھائی''رضاعلی عابدی کا اہم سفرنامہ ہے جو ۲۰۰۶ء میں سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور سے شائع ہوا۔ رضاعلی عابدی نے ۱۹۹۴ء میں غالب کی ۱۲۵/ویں یومِ وفات پر کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ماریشس کا سفر کیا تھا۔اس سفر میں انہوں نے جزیرے ماریشس سفر کی روداد کوتفصیل سے پیش کیا ہے۔رضاعلی عابدی نے اپنے سفرنامے ''جہازی بھائی'' میں ماریشس سے جہازوں میں بھرکر لائے ہوئے چارلاکھ انسانوں کی تفصیل اوران کے جذبات و احساسات کو پیش کیا ہے اور جہازوں میں آنے والے غلاموں اورمزدوروں کو''جہازی بھائی'' کے نام سے مخاطب کیا ہے۔

ہوائی کولمبس (نریندر لوتھر):

''ہوائی کولمبس''نریندر لوتھر کا مزاحیہ سفرنامہ ہے جو ۱۹۸۹ء میں حسامی بکڈ پو مچھلی کمان، حیدرآباد سے شائع ہوا۔نریندر لوتھر نے یہ سفر ۱۹۸۶ء میں اپنے دل کے علاج اور اپنی بیگم کی آنکھوں کی آپریشن کی غرض سے کیا تھا۔سفرنامہ نگار نے ۱۷۵رصفحات پر مشتمل سفرنامے کو تقریباً ۱۴رابواب میں تقسیم کیا ہے،جن کی عنوانات بھی توجہ طلب ہیں۔نریندر لوتھر نے اپنے سفرنامے میں امریکی تہذیب وثقافت، وہاں کی اہم شخصیات، امریکہ کی خارجی پالسی اور معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے کہیں طنز کا سہارا لیا ہے تو کہیں مزاح کی چاشنی اس میں شامل کیا ہے۔

یورپ کا سفر (ف۔س۔اعجاز):

ف۔س۔اعجاز نے ۱۹۹۰ء میں عاشور کاظمی کے ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹس اینڈ لٹریچر کی دعوت پر اوسلو، کوپن ہیگن اور لندن کا سفر کیا تھا۔مشاعرے میں شرکت کی غرض سے ڈنمارک جاتے ہوئے ف۔س۔اعجاز نے لندن اور ماسکو کی سیر کی اور واپسی میں پیرس کو سرسری طور پر دیکھا۔اس تین ہفتوں کے سفر پر مشتمل حالات کو انہوں نے اپنے سفرنامے''یورپ کا سفر''میں درج کیا ہے۔یہ سفرنامہ ۱۹۹۱ء میں منظرِ عام پر آیا، جو ۲۸۹رصفحات پر مشتمل ہے۔ف۔س۔اعجاز کا ایک اور سفرنامہ''سیریا میں دس روز''کے نام سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔

سیر کر دنیا کی غافل (صغرا مہدی):

''سیر کر دنیا کی غافل''اور''میخانوں کا پتہ''صغرا مہدی کے مشہور سفرنامے ہیں۔''سیر کر دنیا کی غافل''جو دراصل پانچ سفر کی تفصیلات کا مجموعہ ہے۔یہ سفرناموں کا مجموعہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا جسے بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اس سفرنامے کا پہلا سفر''سیر کر دنیا کی غافل''کے عنوان سے درج ہے،جس میں صغرا مہدی کے یورپ کے سفر کی تفصیل درج ہے۔دوسرے سفر کی تفصیل کو''مشاہدات ابن بطوطہ''کے عنوان سے درج کیا گیا ہے،جس میں امریکہ کی سیر کے احوال کو پیش کیا گیا ہے۔تیسرا سفر''بچپن کی تلاش میں''پر مبنی ہے۔اس حصے میں انہوں نے اپنے بچپن کی سرزمین بھوپال سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔چوتھا سفر''ذرا انہیں پڑوس میں''میں پڑوسی ملک پاکستان کی سیر کا احوال ہے،جو انہوں نے اپنے عزیز واقارب سے ملاقات کی غرض سے کیا تھا۔اس سفرنامے میں ماریشس کی سیر کا

احوال ''چلتے ہوتو ماریشس چلئے'' کے عنوان سے درج ہے۔

''میخانوں کا پتہ'' صغرا مہدی کے سفرناموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔اس سفرنامے کے عنوان سے قاری کا ذہن کسی اور جانب منتقل ہوجاتا ہے لیکن اس سفرنامے میں مکہ، مدینہ، عراق اور ایران کے سفر کی روداد کو قلمبند کیا گیا ہے۔اس حصّے میں دنیا کے اس میخانے کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں ہزاروں برسوں سے ساری دنیا کو اپنی محبت میں سرشار کر رکھا ہے۔اس سفرنامے میں مقامات مقدسہ کی زیارت کی تفصیل کے علاوہ صغرا مہدی کے کئی اسفار کی روداد ہے، جو انہوں نے ۱۹۷۷ء سے لے کر ۲۰۰۱ء کے درمیان کئے تھے۔ یہ سفرنامہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔اس سفرنامے میں ''سات دن کیکوے کے دیس میں'' کے عنوان سے جاپان ''سمندر سمندر اور ٹک ٹک'' کے عنوان سے بینکاک اور بالی، ''ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو'' میں لندن واسپین اور امریکہ کے سفر کی تفصیل کو پیش کیا گیا ہے۔

ازبیکستان: انقلاب سے انقلاب تک (قمر رئیس):

پروفیسر قمر رئیس اردو کے معروف نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔قمر رئیس کی اردو ادب پر کافی گہری نظر تھی، انہوں نے عاشور کاظمی کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے پچاس سالہ سفر پر ایک ضخیم کتاب بھی مرتب کی ہے۔قمر رئیس نہ صرف ایک افسانہ نگار، شاعر اور سفرنامہ نگار تھے بلکہ اردو درس و تدریس سے بھی وابستہ تھے۔ مرکزی وزارت تعلیم وحکومت ہند کے ''ہندوروس ثقافتی تبادلہ'' پروگرام کے تحت روس کے شعبۂ السنہ ہند اور نیل فیکلٹی آف اسٹیٹ یونیورسٹی تاشقند میں بحیثیت مہمان پہلی مرتبہ جون ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۶ء تک کا قیام بھی کیا۔دوسری مرتبہ ستمبر ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۲ء تک اور تیسری مرتبہ ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء تک اور ۱۹۹۵ء میں بھی انہوں نے ازبیکستان کا سفر کیا تھا۔ان تمام اسفار کی روداد کو انہوں نے ۱۹۹۷ء میں کتابی شکل میں ''ازبیکستان: انقلاب سے انقلاب تک'' کے عنوان سے منظرِ عام پر لایا۔۲۹۷ صفحات پر مشتمل اس سفرنامہ میں ازبیکستان کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی پر مکمل روشنی ڈالی گئی ہے۔اس سفرنامے کو قمر رئیس نے ڈائری کی تکنیک میں لکھا ہے۔

چل چنبیلی باغ میں (مظفر حنفی):

''چل چنبیلی باغ میں'' مظفر حنفی کا اہم سفرنامہ ہے۔مظفر حنفی نے اہل وعیال کے ساتھ ۱۹۹۷ء میں ڈھائی مہینے

کے لیے برطانیہ کا سفر کیا تھا۔اس سفر کے احوال کو''چل چنبیلی باغ میں'' کے عنوان سے کتابی شکل میں ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ یہ سفرنامہ ۲۴۸رصفحات پر مشتمل ہے۔اس سفرنامے میں مظفر حنفی نے اپنے بیٹے پرویز کی شادی کی تیاریاں اوراہل و عیال کے ساتھ کیے گئے سفر کی حسین یادوں کو پیش کیا ہے۔

کنگرو دیس میں (سید ضمیر جعفری):

''کنگرو دیس میں'' سید ضمیر جعفری کے آسٹریلیائی سفر کی روداد ہے۔کرنل سید ضمیر جعفری نے آسٹریلیا کا یہ سفر اپنے بھانجے کی دعوت پر۱۹۸۹ء میں کیا اوراس سفری روداد کو۲۰۰۱ء میں شائع کیا گیا۔اس سفرنامے کے ذریعے سید ضمیر جعفری نے فن سفرنامہ نگاری میں اپنی فنی استعداد کا لوہا منوایا ہے۔سید ضمیر جعفری کا سفرنامہ''کنگرو دیس میں'' اپنے شگفتہ اسلوب اور منفرد زاویہ نظر کی وجہ سے اردو سفرناموں کی روایت میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

آٹھ سفرنامے (قاضی مشتاق احمد):

''آٹھ سفرنامے'' قاضی مشتاق احمد کا مشہور سفرنامہ ہے۔سفرنامے کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ اس سفر نامے میں قاضی مشاق احمد نے آٹھ علاقوں کی سیر کی روداد کو یکجا کیا ہے۔اس سفرنامے میں تین سفرنامے اندرون ملک کی سیر پر مبنی ہیں اور پانچ سفرنامے بیرون ملک کی روداد پر مشتمل ہیں۔قاضی مشتاق احمد نے اپنی زندگی کے مختلف عرصوں میں یہ سفر کیا لیکن ان تمام اسفار کی تفصیل کو اس سفرنامے میں شائع کیا ہے۔یہ سفرنامہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے توسط سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ قاضی مشتاق احمد نے''جس نے یورپ نہیں دیکھا'' کے عنوان سے ایک سفرنامہ شائع کیا ہے۔

وہائٹ ہاؤس کے آس پاس (انیس چشتی):

سفرنامہ''وہائٹ ہاؤس کے آس پاس'' ہمارے دور کے جدید ماہر تعلیم انیس چشتی کے امریکہ کے سفری تجربات پر مبنی ہے۔انہوں نے ۲۰۰۵ء میں امریکہ میں چند روز قیام کیا اور اپنے تجربات میں قارئین کو شریک کرنے کی غرض سے یہ سفرنامہ ترتیب دیا، جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔یہ سفرنامہ کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہے کیونکہ اس میں انیس چشتی کے قلم سے امریکہ کے تعلیمی وسیاسی تجربے کے ساتھ ساتھ امریکہ کا منظر بھی پیش کیا ہے۔

''وادیِ نیل میں بیس دن'' انیس چشتی کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ جون ۲۰۰۲ء میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے سالانہ سیمینار میں شرکت کی غرض سے انیس چشتی نے مصر کا سفر کیا لیکن اس سفر کی روداد کو اپنی مصروفیات کی وجہ سے کافی تا خیر سے شائع کیا۔ یہ سفر نامہ ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا جس پر مولانا سید محمد رابع الحسنی ندوی سے مقدمہ لکھوایا گیا۔ یہ سفر نامہ خالصاً تاریخی، عصری، معلوماتی اور تعلیمی صورتِ حال کا احاطہ کرتا ہے۔

سفر ہے شرط (علی احمد فاطمی):

نئی نسل کے ادبا میں پروفیسر علی احمد فاطمی کا شناخت ایک نقاد کی حیثیت سے ہے۔ان کا شمار نئے ترقی پسند ادبی ناقدین میں ہوتا ہے۔علی احمد فاطمی نے اپنے چالیس سالہ ادبی دور میں لندن، کنیڈا، تاشقند، جرمنی، ماریشس اور پاکستان جیسے ممالک کا سفر کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کے لیے کیا ہے۔ ''سفر ہے شرط'' علی احمد فاطمی کا پہلا سفر نامہ ہے، جو سفر نامہ اور رپورتاژ دونوں ہے۔انہوں نے یہ سفر ۱۹۸۵ء میں لندن میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی ''گولڈن جبلی'' کانفرنس میں شرکت کے لیے کیا تھا۔علی احمد فاطمی ۲۰ / جولائی ۱۹۸۵ء کو اپنے استاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے ساتھ کو ویت ایرویز سے گولڈن جبلی کانفرنس کے لیے لندن روانہ ہوئے۔ یہ سفر نامہ ۱۹۸۶ء میں فائن آفسٹ پریس، الہ آباد سے شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ ۱۹۲ / صفحات پر مشتمل ہے، جو رپورتاژ سے زیادہ سفر نامے کا لطف رکھتی ہے۔اس کے علاوہ علی احمد فاطمی نے ''سات سمندر پار'' (۲۰۰۳)، ''جرمنی میں دس روز'' (۲۰۰۷) اور ''ماریشس میں چند روز'' (۲۰۱۶) جیسے اہم سفر نامے لکھے جسے اردو سفر ناموں کی روایت میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

سفر ناموں میں خاطر خواہ تبدیلیوں کا دور بیسویں صدی کے اواخر کا زمانہ ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں سفر نامہ نگاری میں بھی خاطر خواہ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ پڑوس ملک میں ۱۹۸۰ء کے بعد بے شمار سفر نامے لکھے گئے۔بعض سفر ناموں اور سفر نامہ نگاروں کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی، جس کی وجہ سے ہمارے ملک میں بھی وہ سفر نامے آسانی سے دستیاب ہیں۔لیکن اس کے علاوہ بہت سے ایسے سفر نامے ہیں جو باوجود تلاش و بسیار کے حاصل نہیں ہو سکے۔ ذیل میں ان سفر ناموں کا سرسری ذکر کیا جا رہا ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے دو سفر نامے لکھے جن میں ''اے بنی اسرائیل'' اور ''تو بھی راہ گزر میں ہے'' اہم ہے۔ ''ہمالیہ کے اس پار'' مرزا ادیب کا سفر نامہ چین ہے۔اشفاق احمد کا ''عرش منور''، ''چنگوہ پاچستان'' اور ''سفر در سفر''،

الیاس احمد گدی کا ''لکشمن ریکھا کے پار''، اے حمید کا ''امریکہ میں پانچ سال'' اور ''امریکا نو امریکا نو''، محمد طفیل کا ''یورپ ۱۹۸۴ میں''، ڈاکٹر وزیر آغا کا ''بیس دن انگلستان میں'' اور ''ایک طویل ملاقات''، انتظار حسین کا ''زمین اور فلک'' اور ''نئے شہر پرانی بستیاں''، محمد اختر ممونکا کا ''پیرس ۲۰۵ کلومیٹر''، جمیل زبیری کا ''موسموں کا عکس''، سلیم اختر کا ''ایک جہاں سب سے الگ''، علیم اللہ حالی کا ''ہم مسافر جہاں جہاں پہنچے''، جوگندر پال کا ''پاکستان یاترا'' اور شوکت علی شاہ کا ''اجنبی اپنے دیس میں''، ''سلگتے ساحل''، ''جزیرے جمال کے'' اور ''سورج آدھی رات کا'' وغیرہ سفرناموں کی روایت میں اہم اضافہ ہیں۔

خواتین سفرنامہ نگاروں میں جنہوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد سفر کیا اور اس کی یادوں سے سفرنامہ تحریر کیا ہے، ان میں پروین عاطف کا سفرنامہ ''کرن، تتلی، بگولے''، قرۃ العین حیدر کا ''جہان دیگر''، ثریا حسین کا ''پیرس و پارس''، بشریٰ رحمٰن کا ''ٹک ٹک دیدم ٹوکیو'' (۱۹۹۵)، بلقیس ظفر کا ''مسافتیں کیسی'' اور نوشابہ نرگس کا ''سفرنامہ امریکہ'' اور ثریا حفیظ الرحمٰن کا ''جس دیس میں گنگا بہتی ہے'' خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

اکیسویں صدی میں متعدد معیاری سفرنامے شائع ہوئے ہیں۔ اکیسویں صدی کے جن سفرنامہ نگاروں نے اپنے سفرناموں کے ذریعے فن کو مقبولیت بخشی اس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا ''دید و باز دید'' مرغوب علی کا ''سفر کہانی''، محمود الرحمٰن فاروقی ندوی کا ''ناقابلِ یقین جاپان و چین''، محسن عثمانی ندوی کا ''دنیا خوب دیکھا''، سردار عظیم اللہ خان میو کا ''دیس: سفرنامہ انڈیا''، عظیم اختر کا ''مسافرنواز بہتیرے'' (۲۰۱۱)، ادریس صدیقی کا ''امریکہ نامہ'' (۲۰۱۱) اور ''استنبول سے استنبول تک''، یعقوب نظامی کا ''مصر کا بازار'' (۲۰۱۲) اور صبیحہ انور کا ''دیکھا ہم نے استنبول'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ برِصغیر ہند و پاک میں بے شمار سفرنامے لکھے گئے۔ اس مختصر باب میں ان تمام سفرناموں کا احاطہ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

حوالہ جات

۱۔ یادِ حرم، محمد حماد کریمی ندوی، ص: ۱۸

۲۔ اردو میں حج کے سفرنامے، محمد شہاب الدین، ص: ۲۶

۳۔ آج کل اور سفرنامہ، مرتبہ: محبوب الرحمٰن، ابرار رحمانی، پیش لفظ، ص: ۱

۴۔ اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ص: ۴۹

۵۔ اردو ادب میں سفرنامہ، انور سدید، ص: ۵۲،۵۳

۶۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص: ۲۲

۷۔ لندن اولندن، سید محمد عقیل رضوی، ص: ۷

۸۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص: ۲۴

۹۔ اردو سفرنامہ کی مختصر تاریخ، مرزا حامد بیگ، ص: ۹

۱۰۔ اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت، خواجہ محمد اکرام الدین، ص: ۱۱۳

۱۱۔ اردو میں سفرنامہ، ڈاکٹر انور سدید، ص: ۹۳

۱۲۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص: ۹۰

۱۳۔ اردو ادب میں سفرنامہ، انور سدید، ص: ۱۱۲

۱۴۔ مقدمہ عجائبات فرنگ، مرتب تحسین فراقی، ص: ۴۷

۱۵۔ تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ: تحقیق و تدوین، ڈکٹر مظہر احمد، ص: ۱۴

۱۶۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص: ۹۳

۱۷۔ اردو میں حج کے سفرنامے، ڈاکٹر محمد شہاب الدین، ص: ۶۷

۱۸۔ نمونہ منشورات، احسن مارہروی، ص: ۱۲۷

۱۹۔ داستان تاریخ ادب اردو، حامد حسن قادری، ص: ۳۴۲

۲۰۔ اردوسفرنامے کی مختصر تاریخ، مرزا حامد بیگ، ص: ۵۳تا۵۴

۲۱۔ اردوسفرنامے کی مختصر تاریخ، مرزا حامد بیگ، ص، ۴۵تا۴۶

۲۲۔ تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ: تحقیق وتدوین، ڈاکٹر مظہر احمد، ص: ۲۴۰

۲۳۔ اردوسفرناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت، خواجہ محمد اکرام الدین، ص: ۹۸

۲۴۔ اردوسفرنامے انیسویں صدی میں، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ص: ۲۵۹

۲۵۔ اردوسفرنامے انیسویں صدی میں، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ص: ۲۶۱

۲۶۔ اردوسفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر خالد محمود، ص: ۹۵

۲۷۔ اردوسفرنامہ کی مختصر تاریخ، مرزا حامد بیگ، ص: ۵۴

۲۸۔ اردوسفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر خالد محمود، ص: ۱۱۸تا۱۱۹

۲۹۔ سفرناموں میں دہلی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص: ۳۱۵

۳۰۔ اردوادب میں سفرنامہ، انور سدید، ص: ۱۲۱تا۱۲۲

۳۱۔ اردو میں سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص: ۱۱۰تا۱۱۱

۳۲۔ اردوسفرنامے کی مختصر تاریخ، مرزا حامد بیگ، ص: ٦۷

۳۳۔ اردوسفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، ص: ۱٦۳

☆☆☆

باب سوم

علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا مطالعہ

علی احمد فاطمی کے سفر ناموں کا مطالعہ

جدید اردو سفر نامہ نگاروں میں ایک اہم نام پروفیسر علی احمد فاطمی کا ہے۔ اردو ادب میں علی احمد فاطمی کی شناخت ایک معتبر نقاد کی حیثیت سے ہے۔ ان کا شمار ترقی پسند ادبی ناقدین میں ہوتا ہے۔ علی احمد فاطمی طالب علمی کے زمانے ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان تسلیم کیا۔ علی احمد فاطمی کا ماننا ہے کہ کوئی بھی ادب سماج سے کٹ کر یا ہٹ کر نہیں لکھا جا سکتا۔ چونکہ ادب اور سماج میں گہرا رشتہ ہے۔ علی احمد فاطمی کی ادبی وتنقیدی تصانیف اور مضامین ہی سے ان کی فکری بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

علی احمد فاطمی نے یوں تو اردو ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل میدان تنقید ہے۔ انہوں نے تنقید کے علاوہ غیر افسانوی نثر افسانہ، سفر نامہ، رپورتاژ، خاکہ اور مضمون نگاری وغیرہ میں اپنے قلم کا جوہر آزمایا ہے۔

اس باب میں ہم علی احمد فاطمی کے سفر ناموں کا جائزہ لیں گے۔ سفر نامہ کو اردو ادب میں ایک صنف کی حیثیت سے متعارف کرانے کا سہرا یوسف خاں کمبل پوش کے سر ہے۔ انہوں نے ۱۸۴۷ء میں سفر نامہ ''تاریخ یوسفی'' بہ معروف ''عجائبات فرنگ'' لکھ کر اردو سفر نامہ نگاری کا باقاعدہ طور پر آغاز کیا۔ اس کے بعد اردو سفر نامہ نگاری کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے موجود ہے۔ اردو سفر نامے کو تقریباً ۱۷۴؍برس گزر چکے ہیں آج بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔

علی احمد فاطمی کے سفر ناموں کے کل چار مجموعے ہیں جب کہ جملہ سفر ناموں کی تعداد پانچ (۵) ہے۔ ''سات سمندر پار'' نامی مجموعے میں دو سفر ناموں ''کنیڈا میں چند روز'' اور ''یہ انوکھا دیار ہے یارو'' کو قلمبند کیا گیا ہے۔ ان کے سفر نامے نہایت دلچسپ، ادبی ذوق سے ہم آہنگ اور معلوماتی ہیں۔ علی احمد فاطمی کے سفر نامے ادبی نوعیت کے ساتھ ساتھ معلومات کا خزانہ بھی ہیں۔

علی احمد فاطمی نے دنیا کے کئی ممالک کا سفر کیا اور اپنے کچھ سفر کے احوال کو قلم بند بھی کیا ہے۔ وہ اپنے

سفرناموں میں کہیں ایک ماہر ادیب کی طرح الفاظ کے دریا بہاتے ہیں تو کہیں ایک نقاد کی طرح کسی قوم کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ خوبیوں کو سراہتے اور خامیوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی اپنی قوم وملت کو ان کی خوبیاں اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور خامیوں سے بچنے کا پیغام بھی سناتے ہیں۔

اردو ادب میں علی گڑھ تحریک (سرسید تحریک) کے بعد ترقی پسند تحریک سب سے بااثر تحریک ثابت ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے بہت سی نئی اصناف کو جنم دیا۔اور کچھ جدید اصناف کو بھی اپنے توسط سے جلا بخشی ان میں رپورتاژ، خاکہ اور سفرنامہ وغیرہ اہم ہیں۔۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے قیام کے بعد ایک نئی سوچ اور فکر کی بنیاد پڑی۔ان شہروں یا ملکوں کی سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کو ادبی نقطۂ نظر سے جانچ پرکھ کر ان کی رپورٹ وسفرنامے لکھے گئے۔جس کو مختلف رسائل وجرائد میں شائع کر کے اپنے تاثرات کو عوام تک پہنچانے کا کام کیا گیا۔اس سے خاص طور پر رپورتاژ کی ابتداء ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ سفرنامے کو بھی تقویت ملی۔لہٰذا ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں نے دیکھتے ہی دیکھتے سفرنامے میں طبع آزمائی شروع کر دی۔جس میں سید احتشام حسین کا سفرنامہ ''ساحل اور سمندر''،سید محمد عقیل رضوی کا سفرنامہ ''لندن ولندن''،قمر رئیس کا سفرنامہ ''ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک''،خواجہ احمد عباس کا سفرنامہ ''مسافر کی ڈائری'' اور علی احمد فاطمی کا سفرنامہ ''سفر ہے شرط'' وغیرہ منظرِ عام پر آئے۔ترقی پسند ادیب ونقاد علی احمد فاطمی نے بھی اسی سلسلے میں رپورتاژ کے ساتھ تقریباً پانچ (۵) سفر کی روداد کو الگ الگ سفرناموں کی شکل میں تحریر کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے ۱۹۸۵ء میں سفرنامہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت اردو سفرنامہ تقریباً ۱۵۰/برسوں کا سفر طے کر چکا تھا، جو کسی بھی صنف کی مقبولیت کا ایک واضح ثبوت ہے۔

''سفرنامہ'' اردو کے غیر افسانوی ادب کی وہ صنف ہے، جس کے لیے کوئی خاص تکنیک، اجزائے ترکیبی یا اسلوب مقرر نہیں ہے۔سبھی سفرنامہ نگاروں نے اپنے اسلوب اور تکنیک کے مطابق سفرنامہ رقم کیا ہے۔علی احمد فاطمی کا اسلوب قدیم سفرنامہ نگاروں سے ملتا جلتا ہے۔ان کے سفرنامے سماجی، تاریخی، واقعاتی اور جغرافیائی معلومات سے پُر ہیں۔علی احمد فاطمی نے اپنی جدید ترقی پسندانہ سوچ وفکر کی وجہ سے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اس کو مقبولیت کے عروج پر پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔

علی احمد فاطمی نے اپنے اسفار کسی نہ کسی خاص مقصد کے تحت کیے ہیں۔وہ ایک ترقی پسند، بے باک مقرر اور

ایک فعال و متحرک ادیب و نقاد بھی ہیں۔اسی لیے انہیں مختلف انجمنوں اور یونیورسٹیوں کی علمی دعوت وقفہ وقفہ پر ملتی رہتی ہے۔جس کے باعث انہیں مختلف مقامات کا سفر کرنے کا موقع ملا۔اور انہیں اسفار کی روداد، واقعات اور تجربات و مشاہدات کو انہوں نے اپنے سفرنامے میں قلم بند کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے اپنے ۴۰؍سالہ ادبی سفر میں لندن، پیرس، تاشقند، کنیڈا، جرمنی، ماریشس اور پاکستان جیسے ممالک کا سفر کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کی غرض سے کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بیرونی ممالک میں اردو طبقہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہے۔

علی احمد فاطمی کے سفرناموں کے اب تک چار(۴) مجموعے شائع ہو چکے ہیں (۱)''سفر ہے شرط''۱۹۸۶ء (۲)''سات سمندر پار''۲۰۰۳ء(۳)''جرمنی میں دس روز''۲۰۰۷ءاور(۴) ماریشس میں چندروز کے نام سے فروری تا جون؍۲۰۱۶ءکو ماہنامہ''سب رس'' حیدرآباد میں قسط وار شائع ہوا۔آخرالذکر اسی سفرنامے''ماریشس میں چندروز'' کو پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنی تصنیف''اردو کا عالمی تناظر''میں''ماریشس میں اردو'' کے عنوان سے ۲۰۱۷ء میں براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی سے شائع کیا۔

''سفر ہے شرط''

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

علی احمد فاطمی نے اپنے پہلے سفرنامے کا عنوان ''سفر ہے شرط'' شاید خواجہ حیدر علی آتش کے اس شعر سے متاثر ہو کر کیا ہے۔ ''سفر ہے شرط'' سفرنامہ و رپورتاژ دونوں ہے، جو انہوں نے ۱۹۸۵ء میں لندن میں منعقد ہونے والی انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس ۱۹۸۵ء میں شریک ہونے پر تحریر کیا تھا۔ انھوں نے دورانِ سفر پیش آنے والے اپنے سفر کے تمام حالات و کیفیات اور واقعات کو ذہن میں محفوظ کر لیا اور وطن واپس آنے کے بعد اپنے تجربات و مشاہدات کو سفرنامے کی شکل میں رقم کیا ہے۔ علی احمد فاطمی کا یہ سفر ادبی نوعیت کا تھا لہٰذا اس میں کانفرنس وادبی نشستوں کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔

اس سفرنامے کی خوبی یہ ہے کہ پروفیسر علی احمد فاطمی نے لندن اور پیرس کے متعدد مقامات، تاریخی واقعات، سیاسی، سماجی، معاشی، تعلیمی، ادبی، صنعتی اور تہذیبی و تمدنی صورتِ حال کو بھی اجاگر کیا ہے۔ تاریخ سے دلچسپی اور بخوبی واقفیت کے سبب سفرنامہ نگار نے لندن کے تاریخی آثارِ قدیمہ کا واضح نقشہ پیش کیا ہے۔ علی احمد فاطمی کو تاریخ اور انگریزی ادب پر دسترس حاصل ہے، جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے اس سفرنامے میں تاریخ کا بیان بے باک انداز میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے یہ سفرنامہ پہلی بار کتابی شکل میں فائن آفسٹ پریس، الہ آباد سے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ ''سفر ہے شرط'' ۱۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں رپورتاژ سے زیادہ سفرنامے کا لطف ملتا ہے کیونکہ اس سفرنامے میں ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی کانفرنس کے تین دنوں کی پوری رپورٹ رپورتاژ ہے اور باقی کا حصہ سفرنامہ۔ علی احمد فاطمی

نے اس سفر نامے کو باقر نقوی، عاشور کاظمی اور خالد صابر کے نام معنون کیا ہے۔ جنھوں نے مغرب کی اجنبیت کی کڑی دھوپ میں سایہ دار شجر کا کام کیا اور مشرقی مسافر نوازی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے۔ علی احمد فاطمی نے ۱؍ماہ اور ۲۵؍دنوں تک لندن میں قیام کیا، اسی درمیان ۶؍روز انہوں نے یورپ میں بھی گزارے ہیں۔ اور ان چھ (۶) دنوں کے واقعات کو بھی اس سفر نامے میں رقم کیا ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی ۲۰؍جولائی ۱۹۸۵ء کو اپنے شفیق استاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے ساتھ کویت ائیرویز سے انجمن ترقی پسند مصنفین گولڈن جبلی کانفرنس سے ۱۵؍روز قبل لندن کے لیے روانہ ہوئے اور ۲۰؍جولائی کا پورا دن جہاز ہی میں گزرا۔ علی احمد فاطمی نے سفر نامے کی ابتدا ہی میں ''چند باتیں'' میں اپنے مقصدِ سفر کو بیان کرنے اور سفر نامہ تحریر کرنے کی وجوہات کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

''انجمن ترقی پسند مصنّفین برطانیہ کی گولڈن جبلی تقریبات میں شرکت کا جب فیصلہ لیا تو اپنے مخلص دوستوں کے اصرار کے باوجود ذہن میں سفر نامہ ترتیب دینے کا کوئی خیال تک نہ تھا۔ ویسے بھی ہندوستان میں سفر نامہ لکھنے اور چھپنے کا حق صرف رام لعل کو زیادہ پہنچتا ہے تو ایسے سینیئر ادیب کے آگے مجھ جیسا کم علم اور کم عقل طالب علم جرأت بھی کیسے کرسکتا ہے۔ ویسے پاکستان میں ان دنوں تارڑ، ابن انشاء وغیرہ نے بعض بے پناہ خوبصورت سفر نامے لکھ کر ایک طرح سے لکشمن ریکھا کھینچ دی ہے۔ ان سفر ناموں کے مطالعے سے لندن، پیرس، ٹوکیو، نیویارک وغیرہ سب اتنے قریب ہو گئے ہیں کہ جب تک آپ ہندوستان کا کوئی معمولی سفر طے کریں آپ جرمنی، اسپین، ہالینڈ وغیرہ گھوم آئیں گے۔ ان حضرات کی وجہ سے جدید دور میں سفر نامے نے اپنی باقاعدہ ایک حیثیت بنالی ہے۔ ایسے میں مجھ جیسے مبتدی کی ہمّت اور جسارت کہاں ساتھ دیتی۔ اسی لئے صرف فیصلہ تھا کہ اپنے رسالے کے لئے کانفرنس کی تفصیلی رپورٹ تیار کروں گا۔ کچھ یہی سوچ کر میں نے کانفرنس سے قبل اپنی ڈائری پر زیادہ توجہ نہ دی۔ جب کہ میں پندرہ روز قبل سے ہی لندن پہنچ گیا تھا۔ تقریباً دو ماہ کے دوران قیام لندن کے اردو ادیبوں، شاعروں، ان کی سرگرمیاں، ان کے گروپ، اختلافات اور وہ سب کچھ جو ہمیں وراثت میں ملا ہے اس کو قریب

سے دیکھنے کے مواقع ملے تو خوشی ہوئی اور رنج بھی پہنچا۔'' (۱)

علی احمد فاطمی نے مذکورہ بالا اقتباس میں سفرنامہ تحریر کرنے کے مقصد کے ساتھ اس میں تحریر کی گئی جزئیات اور واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔ علی احمد فاطمی کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ اسباب و وجوہاتِ سفر اور شرکاءِ سفر کا بھی ذکر اپنے سفرناموں میں ضرور کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس سفرنامے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ سفرنامہ سیاسی نقطۂ نظر کا نہ ہو کر ادبی نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ اسی لیے اس سفرنامے میں اردو کی ادبی محفلوں، صحبتوں اور شخصیتوں کا ذکر زیادہ ہے۔

''سفر ہے شرط'' کو نور جہاں ثروت ایڈیٹر ''قومی آواز'' دہلی نے بھی اپنے اخبار کے ادبی کالم میں کچھ حصّے قسط وار شائع کیے۔ اور راج نرائن راز نے بھی ''سفر ہے شرط'' کو پیرس کا حصّہ ''آجکل'' دہلی میں شائع کیا ہے۔ علی احمد فاطمی اس سفرنامہ سے متعلق ''چند باتیں'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ایک بہت بڑا سچ یہ کہ دنیا واقعی بہت حسین ہے۔ بہت دلکش اور بہت دل نواز۔ اس کو دیکھنا اور گلے لگانا ہے تو بس....... سفر ہے شرط۔'' (۲)

علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں سفر کے ابتدائی مراحل، ائیر پورٹ پر ہونے والی مختلف کاروائیاں، وہاں کی سڑکوں اور مختلف شاہ راہوں سے لے کر مصنف کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی تمام تفصیلات بیان کی ہیں۔ انہوں نے آگے سامانِ سفر اور ملاقاتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو عام طور پر اردو سفرناموں میں بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ علی احمد فاطمی اپنے ساتھ پیش آنے والے ہر چھوٹے بڑے واقعات کا ذکر اپنے سفرنامے میں تحریر کرتے ہیں، جس جگہ پر جو بھی چیز متاثر کرنے والی ہوتی ہے اس کی بھی وضاحت کرتے چلتے ہیں اور اپنے ذہن کو مختلف سوالات سے آراستہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمایں:

> ''ہوائی جہاز کا پہلا لمبا سفر۔ پردیس کی اجنبیت۔ کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ ایک سوال جس نے پورے سفر میں پریشان رکھا۔ وہاں سے کویت۔ کویت سے لندن۔ جہاز کے باہر۔ جابجا سکورٹی کا غیر معمولی انتظام۔ جہاز کے اندر لچکتی مٹکتی ہوئی نازنینیں۔ ان کے نرم و نازک ہاتھوں سے ملنے والا عمدہ ناشتہ اور کھانا۔ دیگر خدمات۔ ایک رومانی تصور۔ ۲۰ رجولائی کا پورا دن جہاز میں گذر گیا۔ بلندی پر گئے تو ہم نے اپنے آپ کو خدا کے قریب پایا۔ دنیا کتنی چھوٹی اور حقیر لگی۔ صبح کے نو بجے چلا

ہوا جہاز رات کے نو بجے لندن پہنچا جہاں اس وقت دن کے ساڑھے تین بجے ہوئے تھے۔ باقر نقوی صاحب کے چھوٹے بھائی حسین باقر صاحب ہمیں ائیر پورٹ کے اندر تک لینے آئے تھے۔ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟ کتنے دن رہیں گے؟ جلدی جلدی ہم نے جوابات دیئے۔ انھوں نے ہمارے پاسپورٹ پر ہی نہیں ہماری پیشانی پر مہر لگا دی۔'' (۳)

علی احمد فاطمی نے ان تفصیلات کے بعد سید محمد عقیل رضوی کے بھانجے باقر نقوی، حسین باقر اور عاشور کاظمی سے ملاقات کا ذکر کیا ہے اور ہیتھرو ائیر پورٹ سے ہاؤنسلو ویسٹ تک کی سڑکوں پر بھاگتی ہوئی کاریں، وہاں کے خوشگوار موسم اور درختوں کے فطری مناظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اور اگلے ہی پل گھر پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ سفر کے اگلے دن اتوار تھا، جو لندن جیسے شہر کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لندن کی صبح کا خوبصورت منظر اپنی آنکھوں میں قید کرتے ہوئے سید محمد عقیل رضوی نے ڈاکٹر کلیم عاجز کا یہ شعر پڑھا:

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سنّاٹا آواز نہیں آتی

علی احمد فاطمی نے آگے پھر اپنے سفرنامے میں لندن کے حالات، ماحول و مناظر، مقامات اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ اور مشرقی سوچ و فکر کو مغرب سے مشابہت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''یہ صبح اتوار کی صبح تھی۔ لندن کا اتوار ایک نہایت قیمتی دن۔ ناشتہ کے بعد ہم شہر گھومنے نکلے تو چوڑی سڑکیں اور دوڑتی ہوئی کاریں تو نئی نہ لگیں۔ ہاں ان کا ترتیب اور اصول سے چلنا ذرا عجیب سا لگا۔ نہ شور، نہ بے ترتیبی اور نہ ہی غصّہ و جھنجھلاہٹ۔ ذرا دیر میں ہم پگاڈلی (PIGADOLLY) آگئے جو کسی زمانے میں ریڈ لائٹ ایریا سمجھا جاتا تھا، لیکن اب ایک اچھے اور سجے ہوئے بازار میں تبدیل ہو چکا ہے۔ کار ایک طرف پارک کی اور ہم پیدل چل پڑے۔ چھٹی کا دن۔ انسانوں کی بھیڑ۔ عجب عجب پہناوے۔ عجب عجب رنگ کے ساتھ۔ گلے میں باہیں۔ لبوں پر مسکراہٹ۔ ہاتھوں میں چھلکتا ہوا زندگی کا جام۔ ایسے میں باقر صاحب پوری ذمّہ داری بلکہ فرماں برداری کے ساتھ اپنے ماموں کو بازار، عمارت وغیرہ کے بارے میں

تفصیل سے بتاتے رہے اور میں عمارتوں پر سرسری نظر ڈال کر ٹریفک اور انسانوں کو دیکھتا رہا۔ ایسا کچھ لاشعوری طور پر ہوا۔ انسانوں کی ایک بھیڑ لیکن مسئلہ کوئی نہیں۔ ہمارے دیس میں تو انسان ہی مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ وہ انسان جو قدم قدم پر اصول توڑنے میں لذّت ہی نہیں عظمت محسوس کرتے ہیں اور پھر خود اپنے اور اپنے وطن کے لئے مسائل کی بھیڑ لگا دیتے ہیں۔ باقر صاحب نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ یہاں کا مزاج کچھ اس قدر اچھا بن گیا ہے کہ قانون کی پاسداری میں انھیں بڑکپن اور شرافت کا احساس ہوتا ہے اور زندگی کی سجاوٹ، ترتیب اور آسائش ان کی آتما کی پکار بن چکی ہے۔ اس لئے ملک کا اصول ان کا اپنا اصول بن چکا ہے۔'' (۴)

علی احمد فاطمی نے اس سفر نامے میں لندن کے لوگوں کی ذہن طرازی اور ان کی جدید سوچ وفکر اور اپنے ملک و قانون کی پاسداری کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی اس میں دریائے ٹیمز کا پل اور لندن برج وغیرہ کا بھی بیان بہت روایتی انداز میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی مارکسی نظریے کے حامل نقاد ہیں۔ ان کے اس سفر نامے میں مارکسی نقطۂ نظر کی تمام جزئیات جا بجا نظر آتی ہیں۔

اس سفر نامے کی مرکزی حیثیت عوام کی ہے کہ عوام کیا پسند کرتے ہیں، کیا دیکھتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں اس کی فکری جولانی کیا ہے اس کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے اس سفر نامے میں سفر کی روداد کے ساتھ لندن کے ہوٹلوں، بازاروں، محلوں، اونچی وتاریخی عمارتوں اور انگریزوں کی تہذیب وتمدن کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ انگریزوں اور ہندستانیوں کے اخلاقی معاملات کا بھی جائزہ لیا ہے اور لندن کی حسین عورتوں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ ان سے اپنی انسیت کا اظہار بھی کیا ہے۔ علی احمد فاطمی نے لندن میں خاص طور پر مردوں اور عورتوں کے درمیان جو باہم اختلاط اور کھلا پن دیکھا اس کو بھی بیحد دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک موڑ پر چرچل کا مجسمہ نظر آیا۔ جیسے چرچل ویسا ہی ان کا چوڑا چکلا مجسّمہ اور مجسّمہ کے عین نشیب میں ایک بوڑھی عورت بڑی ادا سے تنی کھڑی ہوئی تھی اور ایک بوڑھا جو غالباً اس کا شوہر رہا ہوگا انتہائی محبت سے اس کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ اس کے بالکل بغل میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کا ایک غول نظر سے گذرا۔ گھیرے میں کھڑے

منتشرلڑ کےلڑکیاں ایک دوسرے سے بغل گیر تھے یا عام زبان میں ایک دوسرے
سے چپکے ہوئے تھے۔ان میں سے ایک نوجوان اپنی محبوبہ کو لپٹائے بے حس وحرکت
کھڑا ہوا تھا بالکل مجسّمے کی طرح اور چرچل کا مجسّمہ غصّے سے گھور رہا تھا۔ایسے رومانی
منظر کو ہم سب شعوری طور پر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔میں سب سے
پیچھے تھا۔اس منظر کا لطف لیا۔پھر تیزی سے آگے بڑھ کے مہذب طریقے سے استاد
کے ساتھ شامل ہوگیا۔'' (۵)

علی احمد فاطمی نے درج بالا اقتباس کو پیش کرتے ہوئے جہاں مغرب کی رنگینیوں کا بیان کیا ہے وہیں اپنے کلاسیکی نقطۂ نظر سے چرچل کے مجسّمے کو بھی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔اپنے اندر کی مشرقیت اوراستادوں کا ادب واحترام باقی رکھتے ہوئے جمالیات کے خوبصورت مناظر کو بھی پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے وہاں کے قدرتی مناظر اور حسین ودلکش مقامات کا بیان حسین انداز سے کیا ہے ساتھ ہی وہاں کی بے حیائی اور خودغرضی پر چوٹ بھی کی ہے۔

علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے کو مختلف ذیلی عنوانات کے تحت باندھا ہے،جس سے قاری ہر واقعہ سے الگ محظوظ ہوتا ہے۔اوراس سے جزئیات میں روانی وتسلسل باقی رہتا ہے۔علی احمد فاطمی وہ سفرنامہ نگار ہیں جو اپنے اوپر طاری ہونے والے تمام اثرات کو قاری پر ظاہر کر دیتے ہیں۔گویا قاری خود شریکِ سفر ہو جاتا ہے اوران حالات سے متاثر ہوتا ہے۔اس سفرنامہ میں''سفر ہے شرط'' کے عنوان کے بعد الگ الگ سرخی دیکھنے کوملتی ہے۔علی احمد فاطمی نے اس سفرنامے کے کل ۲۲ر حصے بنائے ہیں۔پہلے حصے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

''سفر ہے شرط'' کے پہلے حصے کا عنوان'' ہائڈ پارک کے مقرّرین'' ہے،جو لندن کا ایک وسیع وعریض پارک ہے۔اس پارک میں اتوار کی شام کو سیاسی مقررین جمع ہوتے اوراپنے سیاسی موضوعات پر تقریریں کرتے تھے۔علی احمد فاطمی نے اس میدان کا نقشہ،حرکت وعمل،موضوعات اورانفرادیت کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے:

''ہم جیسے ہی لق ودق پارک میں داخل ہوئے دیکھا کہ چاروں طرف لوگ بکھرے
پڑے ہیں۔پارک کا ایک عام سا منظر۔نظروں میں سمائے نوجوان جوڑے۔فٹ
بال کھیلتے ہوئے بچے اور پائپ پیتے ہوئے بوڑھے۔ہم آگے بڑھے تو ایک گول سی
بھیڑ دیکھی اوران کے درمیان ایک آدمی ایک میز نما شے پر کھڑا ازورزور سے تقریر کر
رہا ہے۔اس کے سر پر کمیونسٹ پارٹی کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔چہرے مُہرے سے یہ مقرر

ہندوستانی لگا لیکن پہناوا اور لہجہ انگلستانی تھا۔اچھے خاصے لوگ اسے گھیرے ہوئے توجہ سے سن رہے تھے۔اس کی تقریر مذہب کے خلاف تھی۔اس کی تقریر کے جو جملے حافظے میں اٹک گئے وہ کچھ یوں تھے:

''مذہب نے آج تک کسی مسئلے کا حل تلاش نہیں کیا بلکہ مسئلے بڑھائے ہیں۔۔۔۔۔''

''اقتصادی اور معاشی ترقی میں مذہب ذرا بھی مدد نہیں کرتا۔۔۔۔۔''

(۶)

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں علی احمد فاطمی کا اسلوب دیگر سفرنامہ نگاروں سے کچھ مختلف نظر آتا ہے کیونکہ وہ ایسے حساس سیاح ہیں جو دورانِ سفر پیش آنے والے حالات وواقعات سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔اور وہی تاثر وہ قاری تک پہنچاتے ہیں،جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

علی احمد فاطمی نے آگے اسی حصے میں ملاقاتوں اور دعوتوں کا ذکر کرتے ہوئے باقر نقوی کی والدہ پاپا، بہن نرجس اور بہنوئی یونس صاحب سے ملاقات کا ذکر کیا ہے اور عاشور کاظمی کے گھر پر دعوتوں کا اہتمام اور عاشور صاحب، عمران ارشد، بیگم عاشور اور ان کی بچیوں خوشبو اور بتول وغیرہ سے ملاقات کا ذکر دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''دہلی میں قمر رئیس صاحب نے ہدایت کی تھی کہ لندن پہنچ کر میں عاشور صاحب کی مدد کروں۔ان کا ہاتھ بٹاؤں اس لئے ہم لوگ کانفرنس سے تقریباً بارہ تیرہ روز قبل لندن آ گئے۔چنانچہ آج کا دن (۲۲/جولائی ۱۹۸۵ء) ہم نے عاشور صاحب کے گھر اور ان کے دفتر میں گذارنے کا فیصلہ لیا۔عاشور صاحب کے گھر پہنچا تو ان عتیقہ بھابی (بیگم عاشور کاظمی) نے بتایا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹہ قبل سیفٹی پن کی تلاش میں نکلے ہیں۔تھوڑی دیر کے بعد عاشور صاحب آ گئے۔انھوں نے بتایا پچھلے کئی دنوں سے وہ پورے لندن میں سیفٹی پن کی تلاش کر رہے ہیں۔آج ساؤتھ ہال گئے تھے جو ایک طرح سے ہندوستانیوں کا علاقہ ہے وہاں جا کر ملی۔ہم لوگ کاموں میں لگ گئے۔دعوت نامے۔پروگرام۔بیج۔سب ایک لفافے میں رکھ کر پتے لکھے جانے لگے۔ان سب کاموں کو انجام دینے۔عاشور صاحب کی پلاننگ۔ترتیب اور سلیقہ

دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔اتنی بڑی کانفرنس کرنے کے لئے اتنے سلیقے اور محنت کی ضرورت تھی۔بار بار فون۔ہر ایک سے شائستہ گفتگو۔دوستانہ لہجہ جس نے ان کی شخصیت کو خاصا لچک دار بنادیا ہے جس کی وجہ سے وہ پورے لندن میں اور بالخصوص اردوداں حلقے میں بے حد شہرت رکھتے ہیں۔‘‘ (۷)

’’سفر ہے شرط‘‘ کے دوسرے حصے کا عنوان’’اُردو مرکز بنام افتخار عارفؔ‘‘ ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں لندن کے پگاڈلی میں موجود اردو مرکز اور اس کے ڈائرکٹر افتخار عارف کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔اس حصے میں پورے اردو مرکز کے اسٹاف کے ساتھ وہاں کے الگ الگ سیکشن کا بھی جائزہ لیا ہے۔آگے افتخار عارف، فاروق صاحب، ایلیس فیض صاحبہ اور ان کی صاحب زادی وغیرہ سے ملاقات کا بھی ذکر کیا ہے۔انہوں نے لندن کی ٹیوب (انڈر گراؤنڈ ٹرین)، اسٹیشنوں کی جگمگاہٹ، لائبریری اور میزوں پر رسائل، برطانوی تہذیب،ٹریفک پولس اور ٹیکسی وغیرہ کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔اور اگلے ہی صفحے میں علی احمد فاطمی نے علی سردار جعفری کی باتیں، دہلی اور لکھنؤ کے دور، نارنگ اور جمیل الدین عالی کے تذکرے وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

’’جنگ‘‘ دفتر کا ذکر کیا ہے، جو اردو کا ایک اخبار ہے،جس کے اڈیٹر قاضی اشرف ہیں۔اخبار’’جنگ‘‘ ۱۹۷۱ء سے اپنے صحافتی معیار کو قائم رکھے ہوئے ہے۔انہوں نے’’جنگ‘‘ دفتر ہی میں محمد سرور، سہیل رعنا، اور نازیہ حسن وغیرہ سے ملاقات کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے ایک اور اخبار’’وطن‘‘ کے دفتر کا بھی ذکر کیا ہے،جس کے اڈیٹر علی کیانی ہیں۔یہ بھی اردو کا اخبار ہے، جو ۱۹۷۵ء سے اپنے صحافتی معیار کو قائم رکھا ہے۔یہ دونوں اخبار اُس وقت لندن کے اردو قارئین کی پہلی پسند تھے۔علی احمد فاطمی نے اگلے صفحے پر برطانیہ انجمن کے صدر فارغ بخاری اور نائب صدر بخش لائل پوری سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

اس حصے میں سفرنامے کا ایک اہم کردار عاشور کاظمی کا ہے، جو گولڈن جبلی پروگرام کے منتظم کی حیثیت رکھتے تھے۔علی احمد فاطمی نے ہماری نئی نسل کے بارے میں کلاسیکی ادب نہ پڑھنے کی بھی شکایت کی ہے۔انہوں نے افتخار عارف کا لکھنؤ سے پاکستان جانا، پاکستان سے لندن اور لندن سے نہ جانے کہاں کہاں، ٹی وی کی مقبولیت اور ان کی ذاتی ذہانت وغیرہ کو بھی نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔مصنف نے اس کانفرنس میں نہ صرف اپنی ذمہ داریوں کا ذکر کیا ہے

بلکہ عاشور کاظمی کی محنت ولگن اور اردو کی خدمت کے جذبے کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ نقش ابھر آتے ہیں۔

علی احمد فاطمی ترقی پسند گولڈن جبلی کانفرنس سے تقریباً ۱۲۔۱۳/روز قبل پہلے ہی لندن آ گئے تھے۔ عاشور کاظمی اوران کی بیگم عطیقہ سے ان کی ملاقات ۲۲/جولائی ۱۹۸۵ء کو ہوئی۔علی احمد فاطمی ان کے ساتھ ایک دن رہے اور پروگرام کے تیاریوں میں ساتھ لگے رہے۔ اس پیرائے میں وہ عاشور کاظمی کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے رہے۔اس سفرنامے میں اردو مرکز اور بی بی سی اردو پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

اس سفرنامے کے تیسرے حصے کا عنوان ''ہمدم دیرینہ۔خالد صابر'' ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں اپنے دوست خالد صابر سے ملاقات کا ذکر کیا ہے، جو الہ آباد کے زمانۂ طالب علمی سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے خالد صابر کے یہاں قیام کیا اور اپنی بچپن کی یادیں بھی تازہ کیں۔علی احمد فاطمی اور خالد صابر نے ہی الہ آباد میں اسٹوڈنٹ اسلامک مومنٹ کی بنیاد ڈالی تھی۔جس کے نتیجے اور اختتام کا ذکر کچھ اس انداز میں کیا ہے:

> ''میں نے اور خالد صابر نے الہ آباد کی گلیوں میں ایک ساتھ خاصا وقت گذارا ہے۔آج سے پندرہ سولہ سال قبل ہم دونوں نے مل کر الہ آباد میں اسٹوڈنٹ اسلامک مومنٹ کی بنیاد ڈالی تھی۔یہ بنیاد اتفاق سے میرے گھر پر پڑی۔پھر اس سلسلے میں میرے گھر پر ہونے والی ایک نشست میں میرے رشتے کے بھائی نے ایسی تقریر کی جو مجھے پسند نہیں آئی۔اس ناپسندیدگی کی کچھ اہم وجہیں تھیں۔وہیں سے میری دل چسپی کم ہوتی گئی اور میں دوسری طرح سے سوچنے لگا۔'' (۸)

علی احمد فاطمی نے آگے ومبلڈن (WIMBLDON) کی سیر وتفریح کا ذکر کیا ہے، جو ٹینس کے علاقے کے نام سے پوری دنیا میں مقبول ہے۔انھوں نے کونٹ گارڈن (COVENT GARDEN) کی سیر وتفریح کا ذکر بھی کیا ہے، جسے (OPEN THEATRE) بھی کہا ہے۔لندن کے نئے لوگوں کی آزادی، فکر، ماحول، وہاں کی ادب وتہذیب اور کلچر وقوم وغیرہ کو علی احمد فاطمی نے اپنے سفرنامے میں نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی لندن کے ایک پب کے مناظر کو پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''پب میں خاصی بھیڑ تھی۔جتنے لوگ کرسیوں پر تھے اس سے کئی گنا لوگ کھڑے ہوئے تھے۔منتشر سے جوڑے۔دوستوں کے گروپ اور گروپ کا ہجوم۔سب نشے

میں اپنے ساتھی کی بانہوں میں بانہیں ڈالے وھسکی اور بیئر کا گلاس ہاتھوں میں لئے
ایک ایک لمحے کا حساب لے رہے تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مردوں اور عورتوں
کے یہ سلسلے زندگی کی نام نہاد مسرّتوں کی اوپری سطح پر تیر رہے تھے۔ جب کسی کا دل
چاہتا تو نہایت آسانی اور بےفکری کے ساتھ ہاتھ کمر سے اٹھا کر رخساروں پر پہنچا دیتا
اور پوری آزادی اور بےفکری کے ساتھ ہونٹ سے ہونٹ یوں مل جاتے جیسے ہم اور
آپ ہاتھ سے ہاتھ ملا رہے ہوں۔ پروفیشنل طریقے سے مرد آگے بڑھتا اسی انداز
سے عورت جواب دیتی۔ایک مرد کی پیٹھ ایک دوسری عورت کی پیٹھ سے جڑی ہوئی
تھی۔ جو ایک دوسرے مرد کے ساتھ اسی حرکت وعمل میں مصروف تھی اور محظوظ بھی۔''
(۹)

سفر نامہ نگار نے مذکورہ بالا اقتباس میں انگریزوں کی سوچ وفکر کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہاں کی سٹی بسوں، ٹیکسی اور کاروں کی ویرائیٹی وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔لندن کے مسلمانوں اوران کے مذہبی اور تہذیبی لوازمات، مسجدوں، انجمنوں اور اسلامی تنظیموں وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے اپنے سفر کے دوران خالد صابر سے لندن کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات وغیرہ پر بھرپور گفتگو کی ہے۔لندن کے ایک ریستوراں کا نقشہ کھینچتے ہوئے علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

''یہاں کے مسلم ریستوراں بھی خاصے مقبول ہیں، جہاں کی ڈشیں خاص طور پر چکن
اور بریانی انگریزوں کے درمیان بے حد پاپولر ہیں۔ان ریستوراں میں جائیے تو
زیادہ انگریز ملیں گے۔اس کے برعکس عرب اور ترک انگریزی ریستوراں میں جانا
پسند کرتے ہیں۔خوب شراب پیتے ہیں۔زنا کرتے ہیں اور پھر بعد میں کھانا کھاتے
وقت یہ سوچتے ہیں کہ یہاں کا گوشت حرام ہے یا حلال۔'' (۱۰)

مذکورہ بالا دونوں اقتباس میں علی احمد فاطمی نے انگریزوں کی عریانیت اور فحاش کے ساتھ ہندوستانیوں اور عربیوں کے ظاہر اور باطن پر زبردست طنز کے نشتر چلائے ہیں۔

''سفر ہے شرط' کے چوتھے حصے کا عنوان ''بڑا پری وار۔سُکھی پری وار'' ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں باقر نقوی کے پریوار کا ذکر انتہائی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اس پریوار میں باقر نقوی، فیروزہ، چھوٹے بھائی

حسین باقر اور ان کی بیوی شائستہ، ان کے دونوں بچے رحیم و رضا اور اس کے علاوہ محمد باقر، حسن باقر، بہن نسرین اور ان کے شوہر رضا کاظم وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان سب میں پاپا کی شخصیت سے علی احمد فاطمی بیحد متاثر ہوتے ہیں۔

سفرنامے کے اس حصے میں علی احمد فاطمی آگے باقر نقوی اور فروزہ کے ساتھ لندن کے بازار میں گھومنے گئے، جہاں انگریزوں کو چلاّ چلاّ کر سبزی بیچتے ہوئے دیکھا اور رنگ برنگے عربی تربوز، اسپینی خربوزے، پتّیوں میں لپٹی ہوئی پیاز اور کاغذ میں لپٹا ہوا لہسن وغیرہ بھی دیکھا۔ اور پھر اگلے ہی صفحے پر انہوں نے BANCON COD پارک کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ پارک دراصل بچوں کا ہے لیکن بڑے بھی یہاں آتے ہیں۔ علی احمد فاطمی نے اس پارک میں چلنے والی چھوٹی چھوٹی ریل گاڑیاں، رنگین مچھلیاں، آرٹ اور رنگینی کے بہترین نمونے کا بھی ذکر پرکشش انداز میں پیش کیا ہے۔ اگلے سطور میں علی احمد فاطمی نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس پارک کا تعلق حکومت سے نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے اسے اپنی ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر بنایا تھا۔ اور پھر اس شخص نے اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک پروجکٹ کے طور پر اسے گھومنے پھرنے کے لیے بنایا تھا، جو آج اچھا خاصا پکنک اسپاٹ بن گیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے اگلے صفحے پر ایک اور پارک کیؤ گارڈین (KEY GARDEN) کا بھی ذکر کیا ہے۔ علی احمد فاطمی اس پارک کی تعریف اور وہاں کے قدرتی مناظر کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چاروں طرف دیوار۔ چیڑ اور اخروٹ کے درخت خوبصوتی اور ترتیب سے سجائے گئے تھے۔ لمبے لمبے خوب صورت لان اور کھیلتی کودتی بطخیں بڑا پر کیف منظر پیش کرتی ہیں۔ یہاں بھی تمام طرح کے لوگ۔ ابھی ہم پوری طرح محظوظ بھی نہ ہو سکے تھے کہ موسم نے انگڑائی لی اور دیکھتے دیکھتے بادل چھا گئے اور بودیں سر پر کھیلنے لگیں۔ کچھ کو اس میں بھیگنا اچھا لگا۔ کچھ کو پیار کرنا۔ ہم کیا کرتے؟ ہمارے پاس تو بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔'' (۱۱)

سفرنامہ نگار نے سفرنامے کے اس حصے میں لندن برج اور ٹاور برج کا بھی ذکر کیا ہے، جو لندن کا مشہور اور تاریخی پل ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مشہور تو لند برج ہے لیکن خوبصورت ٹاور برج ہے اور یہ بھی بتایا کہ ان پلوں کی اپنی اپنی کہانیاں ہیں، جو متعدد بار دہرائی جا چکی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کہانیوں کے حوالے سے ٹی ایس ایلیٹ نے بھی اسے علامتی طور پر استعمال کیا ہے۔ علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں لندن کی تاریخ اور جغرافیائی احوال وغیرہ کا

تذکرہ نہایت چابکدستی سے کیا ہے۔

سفرنامہ نگار نے پانچواں حصہ ''بڑا ہے درد کا رشتہ'' کے عنوان سے قائم کیا ہے۔انہوں نے اس حصے میں ذکیہ، (جوان کی بیوی کی کلاس فیلو اور دوست فخر الکریم کے رشتے کی بہن ہیں) سے ملاقات کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی انہوں نے اپنے عشق کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں وہ پوری طرح ناکام رہے۔علی احمد فاطمی لندن کی ذکیہ اور الہ آباد کی ذکیہ کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''لندن کی ذکیہ کو دیکھ کر اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ یہ الہ آباد والی ذکیہ ہے جو ایک پنجرے میں قید تھی۔ یہاں کی ذکیہ تو ایک آزاد پرندے کی طرح لگی جو کھلی ہوا اور آسمان کی وسعت میں آزادی سے اڑتا پھرتا ہے۔کسا ہوا جسم۔ چہرے پر نئے آب وتاب ۔جھلملاتے شلوار اور جمپر میں داخل ہوئی تو مجھے حیرت ہوئی اور ساتھ ہی بے پناہ مسرّت بھی۔'' (۱۲)

علی احمد فاطمی نے آگے اسی حصے میں علی اور ان کی ہمشیرہ جنھیں ذکیہ آنٹی کہہ رہی تھی ان کا بھی ذکر کیا ہے اور الہ آباد کے تمام اعزاء اور الہ آباد یونیورسٹی کی رنگین یادوں کو بھی تازہ کیا ہے۔

سفرنامہ نگار نے اس سفرنامے کا چھٹا حصہ ''نورانی چہرے'' کے عنوان سے قائم کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں اپنے جاننے والوں سے ملاقاتیں اور کانفرنس کی تیاریوں اور میٹنگ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کانفرنس کے بارے میں مختلف ادیبوں کی رائیں اور جدید ترقی پسند نقادوں کی رائے کو بھی درج کیا ہے۔ خاص طور سے شمس الرحمٰن فاروقی کا ترقی پسندوں کے متعلق یہ جملہ ''یہ کانفرنس ترقی پسندوں نے اپنے کفن دفن کے لئے آرگنائز کیا ہے۔''لندن کی ادبی محفلوں میں بڑی تیزی سے گونج رہا تھا۔اور ہال میں پھنسے ادیبوں کی اس بھیڑ میں دو ایک چہرے ایسے بھی دکھائی دیئے جن کی پیشانی پر کبھی کسی زمانے میں ترقی پسندی کا نور چمکا کرتا تھا۔

''سفر ہے شرط'' کا ساتواں عنوان ''پوٹائرہ'' ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں WATERMEN ART GALLERY گھومنے کا ذکر کیا ہے، جہاں ہر دوشنبہ کو انگریزی کے شاعر جمع ہوتے ہیں اور اپنی پوئٹری سناتے ہیں۔ انہوں نے اس محفل میں شاعروں کو سننے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔۳۰؍جولائی ۱۹۸۵ء کو عاشور کاظمی کے گھر پر اس وقت آئے ہوئے مہمانوں سے ملاقات کی اور کانفرنس کی ہئیت ومقصد اور بالخصوص اعلان نامہ وغیرہ

پر کھل کر تبادلۂ خیال بھی کیا ہے۔اس کانفرنس کی میز بانی عاشور کاظمی، فارغ بخاری، بخش لائل پوری اور جاوید حمید قریشی کر رہے تھے۔اور اس کانفرنس میں شامل ہونے والوں میں پاکستان سے صفدر میر، حمید اختر، اوسلے سے سعید انجم، جرمنی سے اسد اللہ اور ہندوستان سے اعجاز علی ارشد اور سید محمد عقیل رضوی وغیرہ کا تذکرہ علی احمد فاطمی نہایت سلیقہ مندی سے کرتے ہیں۔

علی احمد فاطمی نے اگلے صفحے پر کانفرنس کے دوسرے دن قمر رئیس، سید محمد عقیل رضوی اور باقر نقوی کے ساتھ آکسفورڈ یونیورسٹی گھومنے کا ذکر کیا ہے۔آکسفورڈ یونیورسٹی کی منظر کشی بیان کرتے ہوئے علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

> ''یونیورسٹی میں ان دنوں چھٹیاں تھیں اس لئے طلباء وطالبات تو کم تھے لیکن سیاحوں کی بھیڑ اسے پر رونق بنائے ہوئے تھی۔طرح طرح کے لوگ نیم برہنہ لباس میں کھلائے۔بل کھائے ہوئے انسان تعلیم گاہ میں عجیب سے لگے۔جہاں ہم نے یونیورسٹی کی عمارتوں، ہال اور لان کو دیکھا۔وہاں ہم نے برہنگی کو بھی خوب خوب دیکھا۔'' (۱۳)

قمر رئیس نے آکسفورڈ کے لان کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''آکسفورڈ کی دو ہی چیزیں مشہور ہیں ایک تعلیم اور دوسرا لان۔''علی احمد فاطمی آکسفورڈ یونیورسٹی کے لان کا خوبصورت منظر پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''خوبصورت پھولوں سے لدے بڑے بڑے لان ان پر چھوٹی چھوٹی خوبصورت تختیاں ان پر لکھی ہدایات اور اسی طرح ان پر عمل۔نرم ونازک رنگ برنگے پودے۔چاروں طرف پرانی عمارتوں کے ارد گرد خوبصورت منظر کو پیش کر رہے تھے۔'' (۱۴)

علی احمد فاطمی نے آکسفورڈ کی لائبریری اور مسودات کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کو آکسفورڈ یونیورسٹی کی لائبریری کے ماحول نے بہت متاثر کیا، جس کا محاسبہ انھوں نے الہ آباد سے بھی کیا ہے۔۲۱/اگست ۱۹۸۵ء کے دن عاشور کاظمی کے گھر پر وقت گزارنے اور کانفرس کے کاموں میں لگے رہنا کا بھی ذکر کیا ہے۔

''سفر ہے شرط'' کا آٹھواں حصہ ''ادبی تاریخ کا ایک نیا باب'' کے عنوان سے رقم ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی پوری روداد کو بیان کیا ہے۔انہوں نے اپنے اس سفرنامے میں صفحہ نمبر ۶۲/

سے کانفرنس کی روداد بیان کرتے ہوئے پورے کانفرنس ہال کی منظر کشی کو پیش کیا ہے:

''انجمن ترقی پسند مصنفین کے اس پچاس سالہ جشن نے اس کونسل کے لئے نہ صرف اپنا خوبصورت ہال دیا بلکہ مالی تعاون بھی دیا اور ایک وقت تمام مندوبین کو استقبالیہ بھی دیا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے پیچھے تحریک کی تاریخ اور اس کا کردار کام کر رہا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان سب چیزوں کو پیش کرنے۔ غرض وغایت کی وضاحت کرنے اور قائل کرنے میں عاشور کاظمی صاحب نے جتنی محنت کی اس کا اندازہ صرف مجھے ہی نہیں تمام لوگوں کو ہو رہا تھا۔ یہ عمارت اور اس کی بڑی بڑی دیواریں۔ پرُ پیچ راستے بالکل میوزیم کی طرح لگے۔ تلاش کرتے کرتے ہم اس مرکزی ہال کی طرف پہنچے جہاں دروازے پر ہی کچھ بھیڑ نظر آئی اور وہیں پر کتابوں کی ایک اسٹال بھی تھی جس پر رام لعل کی کتاب سب سے نمایاں طور پر رکھی ہوئی تھی۔ ہم جیسے ہی ہال کے اندر داخل ہوئے اس کی شکل وصورت، اونچائی، گولائی اور صفائی دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ سامنے خوبصورت سا لمبا چوڑا اسٹیج۔ کرسی میز کی خوبصورت قطار اور اسی کے نیچے چکا چوند کر دینے والی تحریر U.K. PROGRESSIVE WRITERS ASSOCIATION GOLDEN JUBILEE CELEBRATION 1935-1985۔'' (۱۵)

اس منظر کشی کو ہم سفر نامے کا ایک خاص جز وتسلیم کر سکتے ہیں، جس میں علی احمد فاطمی نے ۳؍اگست ۱۹۸۵ء تا ۵؍اگست ۱۹۸۵ء تک کے کانفرنس کی پوری روداد تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کانفرنس کا یہ حصہ صفحہ نمبر؍۶۲ سے صفحہ نمبر؍۱۰۳ تک پھیلا ہوا ہے، جو تقریباً ۴۰؍صفحات پر محیط ہے۔ کانفرنس کے اس پورے حصے کو ہم رپورتاژ کا نام دے سکتے ہیں۔

علی احمد فاطمی نے اگلے ہی صفحے پر افتخار عارف کے گھر کا ذکر کیا ہے، جہاں کانفرنس کے بعد لوگوں کی بھیڑ، سفر پر لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ، دعوت، سیر وتفریح، ہوٹلوں اور ریستوراں وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔ اس کانفرنس کے خاتمے کے بعد رپورتاژ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ علی احمد فاطمی نے کانفرنس ختم ہونے کے بعد بھی ایک ماہ تک لندن میں قیام کیا۔ جس

میں ایک ہفتہ پیرس میں بھی گزارااور بقیہ حصہ دعوت وتفریح، ادبی مجالس اور ملاقاتوں میں گزارا۔

''سفر ہے شرط'' کا اگلا عنوان ''راجہ گدھ یا رانی گدھ'' ہے۔علی احمد فاطمی نے ۶/اگست کے مختصر بیان کے ساتھ ۷/اگست ۱۹۸۵ء کو ایک نیا عنوان ''راجہ گدھ یا رانی گدھ'' کے نام سے قائم کیا ہے۔انہوں نے اس حصے میں اردو مرکز لندن میں بانو قدسیہ سے ملاقات اور افتخار عارف، اشفاق احمد اور مشتاق احمد یوسفی کی بات چیت کو مکالماتی انداز میں بیان کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے ان لوگوں کے ساتھ سفر نامہ نگاری کی فلسفیانہ گفتگو کی اور مشرقی ومغربی نقطۂ فکر کو بھی پیش کیا ہے۔مشتاق احمد یوسفی کی ظرافت کا ایک مکالمہ ملاحظہ ہو:

> ''یوسفی جو ابھی تک بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے شاید بیمار تھے یا ابھی بیماری سے اٹھے تھے پہلی بار جب بولے تو زبان پر ایک لطیفہ تھا اور ہم سب ہمہ تن گوش۔
>
> ''ایک صاحب جو دنیا میں سوائے اپنے آپ کو کسی کو بیمار اور پریشان حال سمجھتے ہی تھے۔ایک دن سو رہے تھے کہ ان کی بیوی کسی قسم کی تکلیف ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔تکلیف زیادہ بڑھی تو رونے لگیں۔اک دم سے ان کے شوہر کی آنکھ کھلی گھبرا کے پوچھا۔کیوں بیگم کیا آج میری طبیعت زیادہ خراب ہے جو تم اس طرح رو رہی ہو۔'' (۱۶)

''سفر ہے شرط'' کا اگلا حصہ ''مشفق وحسین۔اشفاق حسین'' کے عنوان سے قائم ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں اپنے دوست اشفاق حسین سے ملاقات اور ان کی کتاب ''فیض ایک جائزہ'' کا تذکرہ کیا ہے۔اور اشفاق حسین کا ٹورنٹو کناڈا سے نکلنے والا رسالہ ''اردو انٹرنیشنل'' اور اپنا رسالہ ''اندازے'' کا بھی ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے لندن یونیورسٹی کے وسیع ہال میں اردو مرکز کی جانب سے استقبالیہ مشاعرے، ادبی شامیں اور پرانے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے جلنے کی باتیں بھی تفصیل سے درج کی ہیں۔

علی احمد فاطمی ۱۰/اگست ۱۹۸۵ء کی شام کو اپنے خالو کے ساتھ ایک تقریب میں شرکت کرنے گئے اور اس تقریب میں خاص طور پر ساقی فاروقی سے ملاقات ہوئی۔

۱۱/اگست ۱۹۸۵ء اتوار کا دن پنجابی سبھا کی محفل کا استقبالیہ ہال اور پروگرام کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے لندن کی تاریخی سڑکیں، گلیاں، مشہور پارکوں، میڈم توساڈ (میوزیئم) اور لندن ٹاور وغیرہ کا ذکر اور علی بھائی کی انشاء اللہ

وماشاءاللہ کا تذکرہ طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔اقتباس کے بعد آخرلز کر شخصیت علی بھائی دراصل علی احمد فاطمی کی الہ آباد یونیورسٹی کی محبت ذکیہ صاحبہ کے بھائی ہیں جن کی عادات واطوار، شخصیت اور زبان ولہجہ کا ذکر کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

''مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ میگزین نکالتے ہو۔ماشاءاللہ۔ماشاءاللہ۔میرے لائق کوئی خدمت!''

''مگر آپ کا میگزین سے تعلق۔؟''

''دل چسپی ہے۔کام تو دوسرا کرتا ہوں لیکن اپنی زبان کا معاملہ ہے۔آیئے پہلے آپ کوآفس دکھادوں۔''

''ضرور۔آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں۔؟''

''میں کس قابل ہوں جناب۔پر انشاءاللہ کچھ نہ کچھ تو آپ کے کام آسکتا ہوں۔''

''بھئی ہم تو ادبی میگزین نکالتے ہیں۔''

''ماشاءاللہ۔ماشاءاللہ۔کیا کہنے آپ ایک بڑے کام کر رہے ہو جی۔''

علی بھائی ایک منٹ میں سمجھ میں آ گئے لہجے سے پنجابی تو جسم سے مسلمان۔کاروبار میں پنجابی تو اخلاق میں مسلمان لگے اور جب یہ دونوں آپس میں گڈ ڑ ہو جاتے ماشاء اللہ انشاءاللہ کی تکرار بڑھ جاتی بلکہ اکثر وبیشتر گڑ بڑ بھی کر جاتی۔تیزی سے کار چلاتے ہیں اور شاید سارے کام تیزی سے کرتے ہیں۔'' (۱۷)

''سفر ہے شرط'' کا اگلا عنوان ''دور جدید کا بہرام۔ساقی فاروقی'' ہے۔انہوں نے اس حصے میں ۱۳/اگست کی صبح ساقی فاروقی اور ضیا جالندھری سے ملاقات کی اور پورا دن ان کے گھر پر ہی گفتگو میں گزرا۔ساقی فاروقی کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے علی احمد فاطمی اس اقتباس میں رقم طراز ہیں:

''لندن میں ساقی کی شخصیت حیرت، مسرت اور عزّت کے ساتھ دیکھی اور سمجھی جاتی ہے۔لوگوں نے بتایا کہ ساقی کو بھیس، حلیہ بدلنے کا بڑا شوق ہے یا محض چونکانے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔طرح طرح کی حرکتیں کرتے ہیں۔ہوسکتا ہو یہ صحیح ہو۔دراصل ساقی فن کار اور اداکار کے درمیان کی ایک خوبصورت شے ہیں۔ساتھ ہی مفکر بھی

ہیں۔وہ ایسے شاعر ہر گز نہیں ہیں جو دنیا سے بے خبر بس اپنی شاعری میں (یا اپنی خیال میں) مست رہتا ہے اور اپنے آپ کو آخری استاد سمجھتا رہتا ہے۔لندن میں رہنے والا شاعر ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ساقی بے حد بیدار اور بے قرار قسم کے شاعر اور انسان ہیں۔پھر گفتگو کا اپنا ایک انفرادی انداز ہے جو لوگوں کو متاثر کرتا ہے اور ساتھ ہی شکوک بھی۔لیکن جس نے ان کے اندر کے فن کار کو پڑھ لیا وہ ساقی کو کبھی بھول نہیں سکتا۔'' (۱۸)

سفر نامے کا اگلا حصہ ''آزادی کے دو دن'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں ۱۴/اگست ۱۹۸۵ء کو پاکستان اور ۱۵/اگست کو ہندوستان کی آزادی کے دن کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے ''انڈیا آفسٹ لائبریری'' اور وہاں پر سلیم قریشی و شبانہ کا استقبال اور لائبریری میں کتابوں ومخطوطات کی فہرست کو قلم بند کیا ہے۔

اگلے صفحہ پر ۱۵/اگست کی شام حمیدہ معین کے گھر گئے،وہاں پر حمیدہ معین نے استقبال کیا اور ساتھ میں طعام بھی کیا۔علی احمد فاطمی کی ملاقات لندن میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ،احمد فراز اور مشتاق احمد یوسفی سے ہوئی۔جب کہ یہ لوگ کانفرنس میں موجود نہیں تھے۔اس حصّے میں اگر دیکھا جائے تو شخصیت کے اظہار میں خاکہ نگاری کا بھی عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔علی احمد فاطمی اس سفر کے دوران صالحہ عابد حسین کے سفر نامے ''سفر زندگی کے لئے سوز و ساز'' کا مطالعہ کرتے رہے۔وہ لندن میں بیٹھ کر وہاں کا سفر نامہ پڑھنے سے لطف اندوز ہوئے۔

علی احمد فاطمی سفر کے اگلے ہی دن ۱۶/اگست کو اردو مرکز گئے اور وہاں پر ان کی ملاقات احمد فراز سے ہوئی۔انھوں نے احمد فراز سے ''جنگ'' پر گفتگو کی اور انٹرویو لینے کا ذکر کیا ہے۔احمد فراز کی شخصیت کے بارے میں علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''فراز صاحب۔آپ سے کچھ باتیں ہو جائیں میں جنگ کے لئے آپ سے ایک انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔۔بس ایسے ہی ایک چھوٹا سا انٹرویو'

ہاں حضور۔۔میں خود بھی آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔میں نے لقمہ دیا۔

''آپ کیسی باتیں کریں گے۔؟''

''بہتر ہے۔مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''اپنے رسالے کے لئے ۔۔حسن رضوی کے سوالات سے زیادہ الگ نہ ہوں گے۔
اگر ہوئے تو میں دو ایک سوالات مزید کرلوں گا۔اجازت ہے۔؟''
اس طرح کے اچانک حملوں کے باوجود فراز کے چہرے پر اعتماد کی سرخی ڈوڑ رہی تھی۔چھوٹے چھوٹے گھنگھرالے بال۔کھڑی ناک۔ سپاٹ چہرہ لیکن فکرو خیال سے لبریز۔آنکھیں شعریت اور دھوئیں کی آمیزش سے سرمئی رنگ کی۔داہنے ہاتھ کی کلمے والی انگلی سگریٹ پیتے پیتے سیاہ ہو چکی تھی۔انھوں نے اسی انگلی میں ایک تازہ سگریٹ جلائی اور تیار ہو گئے۔'' (۱۹)

مذکورہ بالا اقتباس سے سفر نامہ نگار کی خاکہ نگاری وصلاحیت پر روشنی پڑتی ہے۔کسی بھی شخصیت سے ملاقات پر سفر نامہ نگاران کے چہرہ مہرہ اور شخصیت سے جو تاثر لیتا ہے اس کونہایت خوبصورتی کے ساتھ رقم کر دیتا ہے۔

سفر نامے کا اگلا حصہ ''بخش لائل پوری کا لہو کا خراج'' کے عنوان سے درج ہے۔علی احمد فاطمی نے اس حصے میں بخش لائل پوری سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے ۱۷/اگست کی شام دوستوں کے ہمراہ ایک تقریب میں جانے کا ذکر اور وہاں کے اہتمام،عمدہ اسٹیج، ریڈیو رکارڈنگ،نشست کی تقریریں اور ادبی گفتگو کا بھی تذکرہ کیا ہے۔انہیں چند معمولی سی باتوں اور تقریروں کے بعد وہ لندن سے فرانس کے لیے روانہ ہوئے۔

سفر نامے کے اگلے حصے کا عنوان ''فرانس کی جانب'' ہے۔انہوں نے اس حصے میں لندن سے پیرس جانے کے سفر کی روداد کو قلم بند کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے سید محمد عقیل رضوی،قمر رئیس، باقر نقوی اور ان کے دو بچوں عمران و کامران کے ہمراہ لندن سے پیرس کی مسافت کار سے طے کی۔لندن سے فرانس کی جانب سفر پر روانہ ہونے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ترقی پسند مصنفین کا کانفرنس کے ہنگاموں کے بعد پروفیسر محمد عقیل، پروفیسر قمر رئیس، فاطمی، باقر نقوی اور ان کے دو بچے عمران و کامران کا چھوٹا سا قافلہ ۱۸/اگست کی صبح ۴/بجے بذریعہ کار روانہ ہوا۔ہلکی پھلکی بارش،جھلملاتے موسم میں پانی کی طرح بہتی ہوئی کار ڈور (DOVER) پہونچتے پہونچتے سورج نے ہماری آنکھوں کے سامنے اپنی آنکھیں کھولیں۔چمکتی ہوئی نارنجی کرنوں سے برطانیہ کے مضافات مسکرا اٹھے۔لمبے لمبے درختوں میں پھنسی اگتے سورج کی کرنیں،گلاب کے گالوں پر

پھوٹتی صبح اور بغیر آواز کے پھسلتا ہوا مرمریں سفر۔آنکھوں میں سحر انگیز مناظر کی ایسی تصویریں کھینچ گیا کہ جس پر دل وجان قربان۔'' (۲۰)

علی احمد فاطمی نے اپنے تاثرات کا اظہار واضح طور پر کیا ہے۔انہوں نے فطرت کی اتنی حسین عکاسی کی ہے کہ قاری خود بہ خود محو ہو جاتا ہے۔علی احمد فاطمی نے جغرافیائی حالات اور موسم کی منظر کشی کو انتہائی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔۲۲رمیل کا دریا اور ۲۸۰رکلومیٹر کی سڑک طے کر کے لیاقت کے گھر پہنچے اور یہیں پر قیام کیا۔ وہاں پر اظہر اور محمود صاحب سے ملاقات ہوئی۔

سفر نامہ نگار نے اگلا حصہ ''انٹرنیشنل ڈنر'' کےعنوان سے قلم بند کیا ہے۔انہوں نے اس حصے میں ایفل ٹاور کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی اگلے دن صبح ایفل ٹاور کی سیر کرنے گئے۔ایفل ٹاور کے گرد جمع لوگوں کی بھیڑ اور وہاں کی رنگینی کا بھی جائزہ لیا ہے۔علی احمد فاطمی کے سفر ناموں کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے سفر ناموں میں قاری کو باہم سفر کراتے رہتے ہیں۔اور وہ جن چیزوں سے خود متاثر ہوتے اسے وہ اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ قاری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

علی احمد فاطمی نے اس سفر میں راستے کے بیان اور میٹروں ٹرین کا بھی ذکر کیا ہے، جو انڈر گراؤنڈ تھی۔ایفل ٹاور اور پیرس کی تہذیب کا ذکر بخوبی کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''فوّاروں کے داہنے اور بائیں طرف مرد اور عورت کے پتّھر کے برہنہ مجسمے پیرس کی تہذیب کا اعلان کر رہے تھے۔اب ہم بھیڑ کے ساتھ رفتہ رفتہ ٹاور کے قریب کھسکنے لگے۔دنیاں کے تمام طرح کے لوگ،دیکھنے والا اگر مزے دار ہو تو ایفل ٹاور سے زیادہ اس بھیڑ میں بسے رنگ برنگے لوگوں کو دیکھے گا۔ان کے کھلکھلاتے بچّوں اور گنگناتی عورتوں کے بندھے جسم کو دیکھے گا جس میں خدا کا حسن بھی ہے اور جغرافیائی خطوط کا برملا اظہار بھی۔اور پھر یہ احساس بھی جاگتا ہے کہ خالق نے یہ سب اس لئے کیا کہ وہ اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کا اظہار کر سکے۔اپنی فن کاری وصنّاعی کا سکہ بٹھا سکے۔پھر تو غالب کا فلسفہ بھی سمجھ میں آنے لگا۔'' (۲۱)

علی احمد فاطمی نے پیرس کے لوگوں کے ہجوم کو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے اور ایفل ٹاور کے اردگرد کی بھرپور

منظر کشی کی ہے۔علی احمد فاطمی آگے آرٹ گیلری کی تعریف بیان کرتے ہوئے مذکور ہیں:

''اب ہم یہاں بازار گھومتے ہوئے ایک آرٹ گیلری میں داخل ہوئے۔مجھ سے گفتگو کر کے لیاقت کا دبا ہوا حوصلہ چمکا اور اب وہ رہنمائی کم، دل جوئی کی فکر میں زیادہ تھے بالخصوص میری دل جوئی جو اندر ہی اندر سب کی دل جوئی کا سامان بن رہی تھی۔ ہم آرٹ گیلری کی مصنوعی تصویریں دیکھنے لگے اور لیاقت صاحب پاس کے لکڑی کے زینے پر بیٹھی ایک زندہ عورت سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔''

(۲۲)

علی احمد فاطمی اپنے سفرنامے میں جگہ جگہ علامت کے طور پر مصنوعی چیزوں کو حقیقی چیزوں میں بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مصنوعی چیزیں دراصل مغربی تہذیب جو مشرقی ذہن وفکر کے لوگوں کو مصنوعی اور مشرقی تہذیب حقیقی معلوم ہوتی ہے۔علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں فرانس کے ایفل ٹاور سے لے کر نا تیرے ڈیم NATRE DAME کو دیکھنے اور وہاں کے بازاروں، عورتوں اور مغربی تہذیب کے مناظر کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی کے سفرناموں میں کردار نگاری کا بڑا دخل ہے اس کی شاید معقول وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ ایک خاکہ نگار بھی ہیں۔ان کے اس سفرنامے میں الگ الگ کرداروں کی کئی تصویریں نظر آتی ہیں۔مثلاً عاشور کاظمی کی والہانہ محبت اور سپردگی، ذکیہ کی خوبصورتی، باقر صاحب کی خدمت گزاری، مہمان نوازی، لیاقت صاحب کی صحبت اور رہنمائی حتیٰ کہ علی احمد فاطمی نے اپنی حسن پرستی اور جدتِ طبع کو بھی خاطر خواہ منظر پر لانے سے نہیں روک سکے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جاؤ جاؤ فاطمی۔'' قمر صاحب اور عقیل صاحب دونوں ہی بول پڑے۔لیاقت صاحب میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔میں نے جلدی سے باقر بھائی کا ہاتھ پکڑا اور اس لڑکی کے قریب پہنچے۔

''ہیلو!''

''ہیلو!''

پیاری سی گول مٹول لڑکی جو بقول لیاقت صاحب کے جرمن تھی، بڑے پیار سے مسکرا کر اپنے اخلاق وتہذیب کا مظاہرہ کیا۔مصافحے کے لئے خود ہاتھ بڑھایا اور صرف

اتنا پوچھا کہ جب ہم ایک دوسرے کو جانتے نہیں تو تصویر کھنچوانے سے کیا فائدہ؟ میری ساری ترقی پسندی منتشر ہوگئی۔ باقر بھائی پھر کام آئے اور بول پڑے:

''یہ لمحہ یادگار تو جائے گا۔ ہم لوگ آپ کے قریب آ جائیں؟''

''اوہ۔ شیور!''

ہم دونوں اس کے قریب آ گئے اور لیاقت صاحب کے کیمرے کی طرف دیکھنے لگے

''اور قریب۔'' وہ بولے۔

ہم اور قریب ہوئے۔ پتہ نہیں ہوئے یا صرف محسوس کیا۔ دل کی دھڑکنیں ایفل ٹاور کو چھونے لگیں۔ جی چاہا کہ اپنا ہاتھ اس کے مرمریں کندھے پر رکھ دیں۔ کچھ اور آگے بڑھیں۔ یہ سب کچھ تو نہ ہو سکا اور ہم اس کے بدن کی مغربی تہذیب کی آنچ سے پگھلنے ہی والے تھے کہ ظالم لیاقت صاحب نے کیمرے کا بٹن دبا دیا اور ہم ڈرامائی طور پر الگ ہو کر نہ جانے کن کن لفظوں میں اس سے شرافت کا اظہار کرتے رہے اور دور عقیل صاحب اور قمر صاحب اپنی گذرتی عمر کو کوستے رہے۔'' (۲۳)

''سفرنامے کا اگلا جز ''وہ حسین رات!'' کے عنوان سے درج ہے۔ سفرنامہ نگار نے اس حصے میں پیرس کی حسین راتوں کو قید کیا ہے۔ پگالی کی رنگینیوں، اوپیرا تھیٹر، لکسم برگ پارک(LUXUM BURG)، سون بورن یونیورسٹی اور دریائے سین کے پل کا ذکر نہایت دلجوئی انداز میں کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے پیرس کی ایک شام قمر رئیس کی ایک عزیز ثریا کے گھر گئے، وہاں پر ملک صاحب، ثریا، ان کے دونوں بچوں اور غلام نبی سے بھی ملاقات کی۔ انہوں نے آگے ورسائل میوزئیم اور بستائل (BESTILE) دیکھنے کا ذکر کیا ہے اور تمام مناظر کو اپنے سفرنامے میں قید کیا ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے میں پیرس کی مختلف مشہور عمارتوں، تفریح گاہوں، ہوٹلوں اور گرجا گھروں وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی پیش کیا ہے۔ علی احمد فاطمی نے پیرس میں لوگوں سے ملاقاتیں، دعوتیں، لیڈو(LIDO) کلب اور CASINO BAR وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

سفرنامے کا اگلا جز ''جنگل کی شہزادیاں'' کے عنوان سے درج ہے۔ اس حصے میں علی احمد فاطمی نے باقر نقوی کا یہ شعر درج کیا ہے:

رات گئے پھرتی آوارہ دوشیزائیں
جنگل کا انداز نرالا ہم نے دیکھا

علی احمد فاطمی نے پیرس کے جنگل کی شہزادیوں (فحّاشہ) اور نیم برہنہ لڑکیوں کا ذکر کیا ہے۔انہوں نے اس میں پیرس کی حسین راتوں اور مغربی تہذیب کو قلم بند کیا ہے۔ پیرس کے چھ دنوں کے سفر کی روداد کو لندن پہنچ کر اختتام ہونے تک کا ذکر اس حصے میں کیا ہے۔علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا خاصہ یہ ہے کہ ان کے اسلوب اشاروں کنایوں سے بھرپور الفاظ وموضوعات نہ صرف کاری کے دل میں تجسس بھر دیتے ہیں بلکہ کسی ملک وقوم کی تہذیب کچھ اس طرح شناخت کرتے ہیں کہ ذہن ودل میں محفوظ ہو جائے۔مثلاً پیرس کی عریانیت،فحاشی اور نیرنگئی طبع کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایں:

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' قمر صاحب کا تجسّس تڑپ کر بولا۔

''طے ہو رہا ہے کہ رات کہاں گذرے گی۔ ہوسکتا ہے کہ انھیں جنگلوں میں۔ ہوسکتا ہے کہ گھر لے جائیں۔جیسا طے ہو جائے۔'' لیاقت صاحب نے اپنی لیاقت کا ثبوت دیا۔ ہماری کار اور آگے بڑھی۔ہم حیرت میں ڈوبے رہے کہ اچانک ایک لڑکی اور نظر آئی۔ بالکل اکیلی۔

''یا اللہ! اس ویرانے میں یہ اکیلی لڑکی۔کوئی مجرم نہ اٹھا لے جائے۔'' قمر صاحب حیرت میں پڑے۔

''یہ پیرس کی فحاشہ ہیں۔اس مرد کو چبا ڈالیں۔ یہاں کی لڑکیاں ویسے ہی مشہور ہیں۔پھر اس قسم کی لڑکیاں۔ان کے پاس اسلحے بھی ہوتے ہیں۔''

ہم بڑھتے ہی گئے کہ ہمیں ابھی ستاروں کے اس پار بھی جانا تھا۔پھر ہم جب اس پار پہنچے تو وہ منظر دیکھا جسے دیکھ کر ہم سبھی شرمائے لیکن پھر بھی دیکھتے رہے۔لذّت کے ساتھ نہیں پورے تحیّر کے ساتھ۔جیسے کوئی سرکس دیکھ رہے ہوں۔دور ایک پیڑ کے سہارے دو سائے ایک دوسرے میں ڈوبے،ایک دوسرے میں نہائے والہانہ طور پر باہم مدغم تھے۔'' (۲۴)

سفرنامہ نگار نے اگلا حصہ ''کتب خانہ کی جگہ تہہ خانہ'' کے عنوان سے منتخب کیا ہے۔انہوں نے اس حصے میں

لندن کے کتب خانے کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے ۲۳/اگست ۱۹۸۵ء کی شام اردو مرکز کے ایک محفل میں جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ محفل رضا علی عابدی سے متعلق یعنی کتب خانہ سے متعلق تھی ،جس میں علی احمد فاطمی اور سید محمد عقیل رضوی بھی شریک ہوئے۔علی احمد فاطمی نے محفل میں لوگوں سے ملاقاتیں ،ثقافتی سرگرمیاں ،پروفیسر قرار حسین کی صدارت اور اردو مرکز میں رضا علی عابدی کی کتاب اور کتب خانے کی تقریبات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے ''سفر ہے شرط'' کا آخری جز ''برطانیہ کا نینی تال'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔انہوں نے آخری حصے میں برطانیہ کے ہوورتھ(HOWARTH) کا ذکر کیا ہے، جسے برطانیہ کا نینی تال کہا جاتا ہے۔علی احمد فاطمی صبح پانچ بجے بریڈفورڈ کے لیے روانہ ہوئے اور صفات احمد علوی کے یہاں قیام کیا اور وہاں سے پھر ہوورتھ گئے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''گہری کالی پیچ دار سڑکیں۔اِدھر اُدھر پہاڑیاں۔سڑکوں پر نشیب وفراز۔اردگرد کالے سیاہ خوبصورت ماحول میں لمبی و گہری وادیاں، برابر کے کھیت۔برابر کے اونچے اونچے پیڑ۔''یہ بالکل شملہ اور نینی تال کی طرح ہے۔'' (۲۵)

علی احمد فاطمی نے درج بالا اقتباس میں ہوورتھ کے علاقے کی خوبصورتی ،پر کیف فضا اور لندن کی تاریخ و جغرافیہ کو نہایت پرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔انہوں نے ''راوی'' دفتر اور اس کے مدیر شیخ صاحب اور''راوی'' کا شمارہ بقرعید نمبر وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے اگلے صفحے میں ریڈفورڈ یونیورسٹی اور وہاں کے اساتذہ سے ملاقات،کلاس روم اور پڑھانے کے انداز پر بھی گفتگو کی ہے۔

علی احمد فاطمی اگلے دن صبح تمام لوگوں کے ہمراہ ونڈر میئر(WINDER MERE) کے سفر کے لیے روانہ ہوئے۔انہوں نے سفر کے دوران ہیلی فوکس(HELI FOX)، ہیب ڈن برج(HEBDON BRIDGE)، بر نلے (BURNLEY)، بلیک برن(BLACK BURN) اور پرسٹن (PRISTION) جیسے مقامات سے گزرتے ہوئے وہاں کے مناظر پہاڑ، جھرنے اور سبزہ زاروں کو آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے ونڈ میئر میں داخل ہوئے۔علی احمد فاطمی ونڈ میئر کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دونوں طرف بلندی کو چھوتے ہوئے پُرشکوہ پہاڑ اُن کی چوٹیوں پر آسمان کی پیشانی چھوتے ہوئے لمبے لمبے سرسبز درخت۔بائیں طرف جھیل۔گہری نیلی جھیل۔اس پر

تیرتی ہوئی رنگ برنگی ناؤیں بڑی ٹیڑھی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی چمکتی ہوئی شفاف سڑک۔‘‘ (۲۶)

علی احمد فاطمی آگے گراس مئیر (GRASS MERE) دیکھنے گئے، جو ورڈ سورتھ کی بستی ہے، جہاں ان کی ولادت ہوئی تھی۔انھوں نے گراس مئیر کی سیر و تفریح کی اور وہاں کے ہر ایک مناظر کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا ہے۔ اس سفر نامے کے آخیر میں حبیب حیدر آبادی اور اقبال مرزا سے ملاقات اور ان کے بک لیٹ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے اگلے صفحے میں عاشور کاظمی سے ملاقات کی اور ان کا انٹرویو لیا۔اور اس کے بعد وہ عتیقہ کے ساتھ بازار گھومنے گئے۔۲؍ستمبر کی شام کو اردو مجلس کے سکریٹری عباس زیدی کے گھر پر نشست کا اہتمام اور سعیدہ گز در سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے اس سفر کے آخری دور میں تمام مخصوص اعزہ و احباب سے الوداعی ملاقات کی اور ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔جن میں وہ ذکیہ کے گھر بھی گئے علی سے ملاقات اور ذکیہ کا شکریہ ادا کیا اور ان کی والدہ کی دعائیں لیں۔

علی احمد فاطمی ۵؍ستمبر کی صبح لندن سے اپنے وطن کے لئے روانہ ہوئے۔انہیں باقر، محمد، حسین باقر اور یونس صاحب ہیتھر وائیر پورٹ تک کار سے چھوڑنے آئے۔ائیر پورٹ پر عاشور کاظمی، فارغ بخاری، بخش لائل پوری اور صابر صاحب بھی ملنے آئے تھے۔ان سب سے ملاقاتیں ہوئی، دیر تک ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں، دوستی اور محبت کی باتیں کیں اور دوبارہ آنے کے وعدے کے ساتھ خدا حافظ کہا۔اس طرح یہ سفر نامہ بشمول رپورتاژ اختتام پزیر ہوا۔

سفر نامہ نگار نے لندن کے ماحول و مناظر اور وہاں کی تہذیب و ثقافت، مقامات اور سماجی زندگی وغیرہ تمام پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے۔لندن و پیرس کا مطالعہ کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستان سے اس کا موازنہ بھی کیا ہے۔دوران سفر بہت سے مناظر اور واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے علی احمد فاطمی نے مشرقی تہذیب و روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔انھوں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ مغرب میں جا کر بسنے والے مشرقی لوگوں پر اگر چہ مغربی تہذیب کی جھلک ضرور ملتی ہے۔ان کے انداز و اطوار رہن سہن، کھانے پینے، بولنے، پہننے اور اوڑھنے وغیرہ کے معاملات میں وہ بے شک مغربی طرز کو اپنائے ہوئے ہیں مگر اپنی تہذیب و اقدار کو وہ حتی المقدور فراموش نہیں کرتے۔ظاہری اعتبار سے وہ جدید معاشرے کے فرد نظر آتے ہیں مگر ان کے دل میں ابھی بھی مشرقی تہذیب کی محبت زندہ ہے۔

علی احمد فاطمی نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ایمان داری سے من و عن بیان

کر دیا ہے۔اس سفرنامے میں جا بجا منظر کشی کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔جس کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار نے تاریخ پر زیادہ زور دیا ہے۔

علی احمد فاطمی کے سفر نامہ ''سفر ہے شرط'' اپنی ادبی خوبیوں جن میں بیان کا ربط، واقعات کا تسلسل، تاریخ اور جغرافیہ کا پرفریب منظر، معاشرت کا حسین بیان اور آج کے مشینی آلات کی دلکش عکاسی نے ان کے اس سفرنامے کو ایک نئی سمت سے روشناس کرایا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا سفر نامہ ''ساحل اور سمندر'' اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز اور ایک نئی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔علی احمد فاطمی نے اسی روایت کو اپنے سفرنامے میں تقویت بخشی ہے۔اس سفرنامے کے مختلف اقتباسات میں اردو کی ادبی وعلمی اہمیت اور اردو کی عالمی ادب میں حیثیت کا وضاحتی حلف نامہ بھی ہے، جو علی احمد فاطمی کے قلم سے صفحہ قرطاس پر رواں ہو گیا ہے۔ یہ سفرنامہ صرف اردو کانفرنس ہی نہیں بلکہ لندن کا ایک تعارف نامہ اور دستاویز کی بھی اہمیت کا حامل ہے، جو اردو ادب کے بین الاقوامی رشتے کی وضاحت کرتا ہے۔

ان کے اس سفرنامے میں زبان کی پختگی، دلکش اسلوب، واقعات کی ترتیب، جزئیات اور منظر کشی کا بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔اس سفرنامے میں ملنے جلنے اور مہمان نوازی کا بیان کچھ زیادہ ہے یا یوں کہیئے اخلاقیات کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔علی احمد فاطمی خود لکھتے ہیں کہ ''جب انھوں نے اس سفرنامے کو تحریر کیا تو اس وقت وہ سفرنامے اور رپورتاژ کی جزئیات سے واقف نہیں تھے، اس لیے جزئیات کی کہیں کہیں کمی مل سکتی ہے''۔ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سفرنامہ ابتدائی دور کی تخلیق ہونے کے باوجود بھی سفرنامے کی تمام جزئیات کو اپنے اندر سمولیا ہے۔اپنی دلکش اسلوب نگاری اور سہل ممتنع کی وجہ سے ''سفر ہے شرط'' جدید دور کے سفرناموں میں ایک کامیاب سفرنامہ ہے۔

''سات سمندر پار''

''سات سمندر پار'' (کنیڈا میں چندروز) پروفیسر علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا دوسرا مجموعہ ہے، جو۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس مجموعے میں دو سفرنامے شامل ہیں۔ پہلا سفرنامہ ۲۰۰۱ء میں کنیڈا کا ہے، جس کا عنوان ''کنیڈا میں چندروز'' ہے۔ علی احمد فاطمی نے یہ سفر اپنے دوست اقبال حیدر کی دعوت پر ۲۰۰۱ء میں کیا تھا۔ یہ سفرنامہ ۸۰/صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسرا سفرنامہ ''تاشقند'' کا ہے۔ دوسرے سفرنامے کا عنوان ''یہ انوکھا دیار ہے یارو'' (تاشقند میں چندروز) ہے۔ یہ سفرنامہ بھی ۸۰صفحات پر مشتمل ہے۔ علی احمد فاطمی نے یہ سفر ۱۹۹۸ء میں کیا تھا جبکہ ''سات سمندر پار'' یعنی سفر کنیڈا انھوں نے ۲۰۰۱ء میں طے کیا۔ شاید ''سات سمندر پار'' جیسے عمدہ عنوان کی غرض سے ہی بعد میں کیے گئے سفر کو مجموعے میں اولیت دی گئی ہے۔

''سات سمندر پار'' سب سے پہلے ۲۰۰۳ء میں سرسوتی آفسٹ پریس، الہ آباد سے شائع ہوا۔ علی احمد فاطمی نے اس مجموعے کے انتساب کو اقبال حیدر، بیگم اقبال حیدر، والدۂ اقبال حیدر اور ان کے تمام بھائیوں اور بہنوں کے نام کیا ہے۔ اس سفرنامے کی ابتدا میں جمیل الدین عالی کا یہ شعر درج ہے:

کتنی بار کئے ہیں ہم نے سات سمندر پار
گھر والی سی کوئی نہیں تھی ناریں ملیں ہزار

سفرنامے کی ابتداء بھی اس شعر سے ہوتی ہے اور اسی شعر سے علی احمد فاطمی نے اپنے سفرنامے کا عنوان منتخب کیا ہے۔ ''سات سمندر پار'' کے ''ابتائیہ'' میں علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> ''دو بڑے سفر کے چھوٹے چھوٹے سفرنامے حاضر خدمت ہیں۔ ان میں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں سوائے اظہار محبت کے تھوڑے سے مشاہدات و تجربات بھی ہیں لیکن اچھے سفرنامہ کے لئے محض اتنا کافی نہیں، اسی لئے اسے کتابی شکل میں شائع

کرنے کا کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔تاشقند کا سفرنامہ نیا سفر میں شائع بھی ہو چکا تھا۔کنیڈا کا لکھا رکھا تھا۔کچھ مصروفیات، کچھ تذبذب میں مدت گذر گئی حالانکہ برادرمحترم اقبال حیدر صاحب کنیڈا سے فون کر کے اشاعت کی تاکید کرتے رہے۔''

(۲۷)

سفرنامہ نگار نے درج بالا اقتباس میں اپنے اس سفرنامے کی وجۂ ترتیب اور لکھنے کے بارے میں بڑی صاف گوئی سے بیان کیا ہے۔علی احمد فاطمی ابتدائیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ سفرنامے دو مختلف وقت اور ایّام میں لکھے گئے ہیں۔علی احمد فاطمی آگے پھر اس سفرنامے کے''ابتدائیہ''میں لکھتے ہیں:

''ان سفرناموں کے بارے میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ یہ دو مختلف ملکوں اور تہذیبوں کے سفرنامے ہیں۔دونوں ہی مقامات پر پندرہ بیس دن سے زیادہ کا قیام نہیں رہا اتنی کم مدّت میں کسی ملک،قوم اور تہذیب کو سمجھ پانا تقریباً ناممکن ہے،اس لئے اس میں بس کچھ اشارے ہیں کچھ مناظر اور کچھ ملاقاتیں وہ بھی اردو دوستوں اور مسلمانوں کے درمیان کی۔'' (۲۸)

اس سفرنامے کی اہمیت اور لکھنے کی وجوہات کو بیان کرنے کے بعد اب ہم ان دونوں اقتباسات کی روشنی میں اس سفرنامے کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ یہ سفرنامے کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

کنیڈا میں چند روز:

سفرنامہ''کنیڈا میں چند روز'' کا تصور کراچی کے جوش سیمنار سے ہوتی ہے۔جس میں اقبال حیدر،بیگم اقبال حیدر،بہن شائستہ اور بیٹا ناہید اور مالی سے ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔اقبال حیدر کے والد الہ آباد سے تھے۔اقبال حیدر اور ان کی بڑی بہن کی پیدائش بھی الہ آباد میں ہوئی۔اگر ہم اقبال حیدر کی شخصیت پر نظر ڈالیں تو ان کے اجداد الہ آباد سے تھے جو تقسیم کے وقت پاکستان (کراچی) چلے گئے اور معاش کے سلسلے میں کنیڈا آ گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔علی احمد فاطمی نے اقبال حیدر کے اجداد اور خاندان کا ذکر اپنے سفرنامے میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔اقبال حیدر جوش ملیح آبادی کے بہت بڑے مداح تھے اور انہوں نے علی احمد فاطمی اور قمر رئیس کے ساتھ مل کر رسالہ''جوش بانی'' نکالا، جو سیاست پر مشتمل ایک مکمل رسالہ تھا۔

۲۲ر جون کو علی احمد فاطمی کا جہاز سے ٹکٹ تھا۔ اس سفر سے پہلے ہی ۱۶ر جون کو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے اپنی والدہ کے انتقال کا دل سوز واقعہ اس سفر نامے میں پیش کیا ہے۔ ۲۲ر جون ۲۰۰۱ء کو علی احمد فاطمی دہلی ائیر پورٹ سے ۱۲ر بجے رات کنیڈا کے لیے روانہ ہوئے۔ اور تقریباً ۸ر گھنٹے پرواز کے بعد صبح ۸ر بجے جہاز لندن کے ''ہیتھرو ائیر پورٹ'' پر اترا۔ علی احمد فاطمی کے لندن کا سفر پورا ہونے پر ہی گھر کے تمام غموں کو بھلا کر اب کچھ پل کے لیے ان کا ذہن معتدل ہو چکا تھا۔ انھوں نے لندن کے ''ہیتھرو ایئر پورٹ'' کا حسین و دلکش مناظر اس طرح پیش کیا ہے:

> ''خدا کی بنائی ہوئی دنیا۔ انسانوں کے مختلف چہرے۔ طرح طرح کے ملبوسات عادات واطوار۔ ایک طرف نیم برہنہ سگریٹ پیتی ہوئی عورتیں تو دوسری طرف سر سے پیر تک جدید طرز کے برقعوں میں لپٹی ہوئی عورتیں۔ کچھ ایرانی عورتیں بھی تھیں جن کے شوہر رواں دواں فارسی بول رہے تھے۔ لندن جیسے ایئر پورٹ میں وقت گزاریئے تو بڑے بڑے غم بھول جائیے۔ صرف عورتوں کو دیکھ کر نہیں بلکہ خدا کی قدرت کو دیکھ کر۔ انسانوں کو دیکھ کر اس کی ترقیوں کو دیکھ کر..... ۔'' (۲۹)

علی احمد فاطمی اپنے سفر کے دوران ایئر پورٹ کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے جمگھٹے اور بھیڑ بھاڑ میں شریک خوبصورت عورتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ خدا کی قدرت اور انسانی ترقی کو بھی جمالیات اور حقیقتِ بیانیہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور دنیاں میں رہنے اور ترقی کرنے کے اسباب کو بھی نمایاں کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

علی احمد فاطمی لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ سے ۲ر گھنٹے بعد کیلگری کے لیے روانہ ہوئے اور تقریباً ۸ر گھنٹے پرواز کے بعد کیلگری ایئر پورٹ پر ۳ر بجے دن میں پہنچے۔ اس وقت ان کی گھڑی میں رات کے ۳ر بجے تھے۔ علی احمد فاطمی کیلگری ایئر پورٹ سے باہر نکلے اور وہاں سے اقبال حیدر کے آفس گئے، جہاں ان کا استقبال سجاد صاحب نے کیا۔ اور پھر اقبال اور بیگم اقبال کے ہمراہ ان کے گھر گئے اور ان کی والدہ آپا سے ملاقات ہوئی۔

علی احمد فاطمی نے کنیڈا کے دو شہروں میں ۲۱ر دنوں تک قیام کیا، جن میں ابتداء کے ۱۰ر دنوں تک انہوں نے کیلگری میں قیام کیا اور ۴ر روز ٹورنٹو میں اور پھر آخر کے ۵ر روز کیلگری میں مقیم رہے۔ سفر کے آخری دن ٹورنٹو میں قیام کیا اور پھر یہیں سے ''ہیتھرو ایئر پورٹ'' لندن ہوتے ہوئے دہلی اور پھر الہ آباد اپنے وطن واپس ہوئے۔

علی احمد فاطمی نے اس پورے سفر میں ان دونوں شہروں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیائی حالات، موسم اور

رسم و رواج کو دیکھا، محسوس کیا اور پھر اپنے سفرنامے میں پرویا ہے۔اس سفرنامے میں انہوں نے وہاں کے پارکوں ،ہوٹلوں اور میٹروٹرین کے ذکر کے ساتھ وہاں کے لوگوں کے لباس اور غذا کا بھی ذکر بڑی جزئیات نگاری سے پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی وہاں کی تہذیب ولباس کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کیبن سے باہر نکلے تو سامنے بیگم اقبال حیدر یعنی نگی بھابی کھڑی تھیں۔جینز میں ملبوس بھابی بڑی کم سن لگ رہی تھیں۔انھیں جب میں نے کراچی کے جوش سمینار میں دیکھا تو تب بھی کم سن لگی تھیں لیکن اس وقت کراچی کے لباس یعنی شلوار جمپر میں تھیں اس وقت وہ کنیڈا میں تھیں ...... کچھ تو فرق ہونا ہی چاہئے تھا۔''
> (۳۰)

علی احمد فاطمی نے اس اقتباس میں بیگم اقبال حیدر کے ملبوسات اور پاکستان ولندن کے ذریعے مغرب ومشرق میں تہذیبی فرق کو بھی واضح کیا ہے۔انہوں نے اس سفرنامے میں تاریخ کے مطابق تمام دن کے مناظر وواقعات کو ترتیب سے بیان کیا ہے، جس سے قاری کو روز بہ روز بدلا ہوا شہر معلوم ہوتا ہے۔

علی احمد فاطمی کنیڈا پہنچنے کے اگلے ہی دن صبح کا منظر اور اقبال حیدر کی والدہ جن کو وہاں ''آپا'' کہا جاتا ہے کی مشرقی رہن سہن اور طور طریقوں کو دیکھتے ہوئے مذکور ہیں:

> ''صبح دیر تک سوتے رہے۔فریش ہو کر نیچے آئے تو میز پر بیٹھی ہوئی آپا پان کا بیڑا لگا رہی تھیں۔میں نے جھک کر آداب کیا تو ایک مخصوص مشفقانہ لہجہ سے کہا۔''جیتے رہو!''زندہ رہنے کا مزہ آ گیا....... بھابی نے چائے پلائی اور تیار ہونے کو کہا کہ بازار گھومنے چلیں گے چنانچہ ناشتہ کر کے ہم یونہی گھومنے کی غرض سے بازار کی طرف چل پڑے۔پُر رونق بازار۔سجے ہوئے صاف ستھرے راستے....... قطار سے کھڑی ہوئی گاڑیاں لیکن رنگ برنگے انسانوں کی بھیڑ اسی طرح بے ترتیب۔مرد اور عورت کھلونے کی طرح اچھلتے کودتے بچے۔نوجوان جوڑے۔کہیں بے قراری کہیں بے اختیاری اور کہیں اندازِ کاروباری۔'' (۳۱)

سفرنامہ نگار نے اس اقتباس میں کئی جزئیات کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ایک اچھے سفرنامہ نگار کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ جزئیات کو بیان کرے اور ساتھ ہی اپنے

تجربات ومشاہدات کو بھی شامل کرے۔علی احمد فاطمی کے سفرناموں میں یہ سبھی خصوصیات ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔علی احمد فاطمی کبھی کبھی سفرنامہ بیان کرتے کرتے شاعرانہ انداز بھی اختیار کر جاتے ہیں۔اور ردیف وقافیہ کے ذریعے قاری میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے،جس سے ان کے سفرنامے کو لوگ زیادہ پسند کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی نے اگلے ہی دن نیشنل پارک گھومنے کا ذکر کیا ہے۔اقتباس ملاحضہ ہو:

''ناشتہ کے بعد آج پورے خاندان کا قافلہ نیشنل پارک کی طرف چلا۔کیلگری سے تقریباً دوسو کلومیٹر کے فاصلے پر بسا یہ پارک ریلوے کے تین مزدوروں نے ۱۸۸۵ء میں تیار کیا لیکن اس کے ایجاد اور ناموری کو لے کر تینوں میں اختلافات ہو گئے تو کنیڈا گورنمنٹ نے اسے اپنی تحویل میں لے کر اسے مزید خوبصورت بنا دیا۔''

(۳۲)

سفرنامہ نگار نے درج بالا اقتباس میں نیشنل پارک کی تاریخ بیان کی ہے۔علی احمد فاطمی آگے پھر اس پارک کی خوبصورت منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سبز بھوری پہاڑیوں کی گود سے پھوٹتا ہوا چشمہ۔چاندی جیسا پانی دور کسی مقام سے گھن گرج پیدا کرتا ہوا یہ چشمہ آگے چل کر ٹھنڈی جھیل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف خوبصورت کنارے اور اس پر چلنے اور بیٹھنے کے معقول انتظامات۔ طرح طرح کے لوگ..... موسم میں قدرے نمی تھی اور خنکی بھی۔'' (۳۳)

علی احمد فاطمی نے اس اقتباس میں پارک کی خوبصورتی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اقبال حیدر اور ان کے بھائی جمال،عرفان اور تمام بھابیاں،بہنیں اور پیارے بچوں کے پکنک کا بھی ذکر کیا ہے۔اگلے صفحے میں علی احمد فاطمی مشرق ومغرب کا فرق واضح بیان کرتے ہوئے مذکور ہیں:

''نگی بھابی جو ان میں سب سے بڑی تھیں۔سب سے چھوٹی لگتی تھیں لیکن اپنی سنجیدگی بُردباری اور رکھ رکھاؤ میں وہ واقعی سب سے بڑی تھیں۔سب کی بڑی بھابی جبکہ سب انھیں بھاوج کہتے ہیں۔ہماری طرف بھاوج چھوٹی بھابی کو کہتے ہیں۔''

(۳۴)

سفرنامہ نگار نے اس اقتباس میں مشرق ومغرب کا فرق اور خاص طور سے مسلم گھرانوں کی ادب وتہذیب کو بھی

پیش کیا ہے۔اس سفرنامے میں گار میں بہتا ہوا نمک کا چشمہ،قدرت کے بنائے ہوئے خزانے اور وہاں کے خوبصورت مقامات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

علی احمد فاطمی دوسرے دن صبح اقبال حیدر اور شائستہ کے ساتھ گھومنے گئے۔آج وہ بڑے کتب خانے میں گئے ، جسے یہاں چیپٹر (Chapter) کہتے ہیں اور کچھ کتابیں بھی خریدی اور ساتھ ہی انیتا دیسائی، پنکج مسرا اور سلمان رشدی کی کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے۔انہوں نے مغرب میں کتابوں کی قدر و قیمت،علم کا وقار اور علم کی رنگا رنگی کا بھی ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ مغرب میں پاکستانی ڈراموں کی دھوم دور دور تک ہے۔مغرب میں پاکستانی ڈرامے اور ہندوستانی فلمیں لوگ خوب پسند کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی وہاں کے مذہبی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کنیڈا بظاہر آزاد خیال ملک ہے لیکن اس کے باوجود وہاں کے مسلمان خاص طور پر شیعہ حضرات مجالس،محرم،قرآن وحدیث اور امام باڑہ وغیرہ کی پابندی کرتے ہیں۔

علی احمد فاطمی دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد شاپنگ کرنے ایک بڑے شاپنگ سینٹر میں داخل ہوئے جہاں کپڑے ہی کپڑے تھے۔علی احمد فاطمی نے مغربی ملکوں میں کم کپڑے پہننے کے فیشن،مغرب میں مشرق کے کپڑے اور وہاں کی تہذیب اور ماحول کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''کپڑوں کی اس دکان میں جو بھی نوجوان نسوانی شخصیتیں دکھائی دیتیں ان میں بیشتر نیم برہنہ ہوتیں۔ضرورت سے زیادہ کھلا ہوا سینہ اور اس سے بھی ضرورت سے زیادہ کھلی ہوئی ٹانگیں۔میں یہی سوچتا رہتا کہ جب ان کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے تو پھر یہ کپڑوں کی دکان میں کیا کر رہی ہیں۔لیکن پھر خیال آیا کہ ان کو اتنے تو کپڑے چاہئے جتنے کہ بیحد ضروری ہیں۔کیا کریں یہ مجبوری ہے۔ان کی نہیں سماج کی..... تہذیب کی لیکن جس تیز رفتاری سے یہ آگے بڑھ رہے ہیں ترقی کر رہے ہیں پتہ نہیں کب یہ مجبوری بھی ختم ہو جائے کہ مغرب کی زندگی مجبور زندگی جینا نہیں چاہتی۔ہم نے یہ بھی دیکھا کہ پورے مغرب میں مشرق کے کپڑے (Textile) بیحد شہرت رکھتے ہیں شاید اس کی وجہ یہی ہوگی کہ مشرق میں ابھی با قاعدہ کپڑے پہنے جاتے ہیں۔انھیں ابھی کپڑوں کی ضرورت ہے۔خدا کرے یہ ضرورت باقی رہے کہ صدیوں کے تہذیبی سفر کے بعد ہم نے تن ڈھکنے کی تہذیب سیکھی۔اور شاعرانہ طور

پر بھی یہ بات درست ہے کہ حسن پوشیدگی میں زیادہ ہے اظہار نمائش میں کم.....
اظہار نمائش سے ہوس تو جاگ سکتی ہے۔ پاکیزہ جمال نہیں۔ یہ بات ہزار پرانی سہی
لیکن درست یہی ہے۔'' (۳۵)

علی احمد فاطمی کی خوبی یہ ہے کہ کوئی محفل ہو یا کوئی جگہ جو بھی اثر ان پر ہوتا ہے اسے بھی وہ بے باک انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ ویسے تو یہ انگریزوں کے تہذیب کی تعریف کرتے ہیں لیکن مشرقی و مغربی تہذیب کو بھی الگ الگ پیرائے میں دیکھتے ہیں۔ ان کے تہذیب کے کھلا پن اور آزادانہ رویہ کے قائل ہیں۔ وہ ایک ترقی پسند ادیب ہونے کے باوجود اس کھلے پن سے مرعوب ہوتے ہیں اور اپنے گھر والوں کو ان پر ترجیح دیتے ہیں۔

علی احمد فاطمی اگلے دن صبح سو کے اٹھے اور دیکھا تو اقبال اور نگی ناشتہ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ علی احمد فاطمی مغربی تہذیب اور خاص طور سے عورتوں کے ملبوسات پر طنزیہ نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اقبال بھائی بسکٹ کو چائے میں ڈبو کر کھا رہے ہیں مجھ سے بھی کہا۔ بلا تکلف ڈبو کر
کھائیے یہاں کے مقامی لوگ بھی ڈبو کر کھاتے ہیں اسے وہ ڈنک کہتے ہیں اسی نام
سے بسکٹ کی دوکانیں بھی ہیں۔'' (۳۶)

اس طرح علی احمد فاطمی نے جزئیات کو بیان کرتے ہوئے مشرقی و مغربی تہذیب کا تقابل کیا ہے۔ انہوں نے اس سفرنامے میں کبھی مشرقی تہذیب کو بڑھایا ہے تو کبھی مغربی تہذیب کو اور ساتھ ہی انہوں نے عورتوں کا بھی ذکر مسلسل بیان کیا ہے۔ علی احمد فاطمی اپنے سفرناموں میں سفر کے واقعات کو ادبیت کے لبادے میں پیش کرتے ہیں۔ حسن و جمال کا شائق ہر شخص میں ہوتا ہے لیکن علی احمد فاطمی اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آتے ہیں۔۔ وہ دوستوں، عالموں اور کتابوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر بھی بھرپور گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں نسائی کردار اور ان کے حسن و جمال کا ذکر بارہا ملتا ہے۔ علی احمد فاطمی نسائی کردار کو جس خوبی سے پیش کرتے ہیں اسی طرح قاری کو بھی محظوظ کراتے ہیں۔

علی احمد فاطمی کیلگری میں ۱۰ ردنوں کے قیام کے بعد اشفاق احمد کی دعوت پر ٹورنٹو کے لیے روانہ ہوئے، جہاں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ستّرویں (۷۰) سالگرہ کے موقع پر ''اردو انٹرنیشنل۔ کنیڈا۔ جشنِ نارنگ'' منایا جا رہا تھا۔ علی احمد فاطمی تقریباً ساڑھے تین گھنٹے کے پرواز کے بعد ۱۰ ربجے ٹورنٹو پہنچے۔ علی احمد فاطمی ایئرپورٹ سے اشفاق احمد

کے ہمراہ گھر گئے وہاں پر امجد اسلام امجد، ریحانہ قمر اور پیرزادہ قاسم وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔علی احمد فاطمی شام ۷؍بجے شہر کے بہترین ہوٹل رامدہ ہال گئے، جہاں مشاعرے کا اہتمام تھا اور وہاں وسیم بریلوی، عبدالقوی ضیاء، محسن بھوپالی، نسیم سید، عبدالرحمٰن صدیقی، مونا شہاب، تقی عابدی، پرویز، ذکیہ، انور مسعود، مشکور یار، حمایت علی شاعر اور جمیل الدین وغیرہ سے بھی ملاقات کی۔علی احمد فاطمی ٹورنٹو شہر کے بہترین ہوٹل رامدہ ہال کی خوبصورتی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اسٹیج پر بڑا سا بینر لگا تھا۔''اردو انٹرنیشنل۔کنیڈا۔جشن نارنگ'' جدید طرز کا اسٹیج اور دائیں بائیں گیلریوں سے سجا اور بھرا ہال بڑی دل نواز تصویر پیش کر رہا تھا۔''

(۳۷)

علی احمد فاطمی نے ''جشنِ نارنگ'' پروگرام کو چند صفحات میں جشن کی پوری رپورٹ اور پروگرام کی تقریریوں کو بھی پیش کیا ہے۔اس رپورٹ میں گوپی چند نانگ کی ایک تقریر بھی شامل ہے ساتھ ہی مشاعرے کے اہتمام کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

علی احمد فاطمی دوسرے دن شام کو ''جشنِ نارنگ'' پروگرام میں شریک ہوئے۔ہوٹل کے خوبصورت ہال اور جشنِ نارنگ کے اہتمام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شام کو جس ہال میں جشن نارنگ کا انعقاد ہونا تھا اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔نہایت بڑا اور خوبصورت اور جدید طرز میں بنا سجا ہال بالکل پروفیسر نارنگ کے شایانِ شان تھا۔دور ایک طرف بڑا سا بینر چمک رہا تھا جس میں بہت نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا'اردو انٹرنیشنل کنیڈا' بڑا سا اسٹیج۔ان پر رکھی ہوئی عمدہ جگمگاتی ہوئی کرسیاں۔''

(۳۸)

علی احمد فاطمی نے جشن نارنگ کے انعقاد کو بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے، جس میں کرامت علی غوری، علی احمد فاطمی، اور علی صاحب کی تقریریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔اور جلسے کے آخر میں لوگوں کے آپس میں ملنے ملانے کے دور کے ساتھ ہی جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

علی احمد فاطمی نے جشن کے اگلے دن گوپی چند نارگ کے ساتھ لنچ کا ذکر بڑے مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بڑے اہتمام کا لنچ تھا۔شاندار مسلمانی کھانا کھا کر ہم سیر ہوئے۔ پانی پینے کی غرض سے جیوں ہی ایک سمت مڑا تو فرج کے دروازے پر اچھے مسلمان ہونے کی شرائط لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے غور سے پڑھا اس میں کہیں گوشت مرغ کھانے کی شرط نہ تھی پھر بھی ہم نے ڈٹ کر گوشت کھایا۔سبھی نے کھایا ساری اُمّت کھا رہی ہے جائداد بیچ بیچ کر کھا رہی ہے۔ اور کچھ لوگ تو اسے ایمانی جذبے کے ساتھ کھاتے ہیں۔گوشت کھانا ایمان کا جزو اعظم ہے۔ بہر حال ہم نے اپنے اچھے مہمان اور اس سے زیادہ اچھے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔'' (۳۹)

علی احمد فاطمی نے مذکورہ بالا اقتباس میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنزیہ نقطہ اور ساتھ ہی فلسفیانہ گفتگو بھی پیش کی ہے۔اس سفرنامے میں علی احمد فاطمی کا اپنے دوستوں سے ملاقاتوں اور دعوتوں کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ان کے اس سفرنامے میں اخلاقیات کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

علی احمد فاطمی دوسرے دن تقریبات کی رپورٹ لکھنے میں مصروف تھے اور پھر اشفاق حسین کے ساتھ بینک کے کسی کام کے سلسلے میں نکلے۔انھوں نے سفر کا ذکر کرتے ہوئے ٹورنٹو کی تاریخ وجغرافیہ کو اس طرح پیش کیا ہے:

''تھوڑی دیر میں ہم ایک نہایت صاف ستھرے علاقے سے گذر رہے تھے علاقہ اتنا صاف اور شفاف تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہاں انسانوں کی آمد و رفت بھی ہے۔ بیزاری کی حد تک صفائی اچھی نہ لگی..... اشفاق نے بتایا کہ اس علاقہ میں چین کے لوگ زیادہ رہتے ہیں۔'' (۴۰)

علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں ٹورنٹو کے ہوٹلوں، بازاروں، دعوتوں، ملاقاتوں اور مغربی تہذیب کو ایک دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی ٹورنٹو سفر کے آخری دن بیدار بخت کی دعوت پر ان کے گھر گئے اور وہاں پر بیدار صاحب اور انیتا سے ملاقات کی اور ساتھ میں کھانا بھی کھائے۔

علی احمد فاطمی کا ''جشن نارنگ'' ٹورنٹو کے پانچ دنوں کا سفر پورا کر کے پھر کیلگری واپس آتے ہی اگلے ۲ دنوں تک دعوتوں اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور ساتھ ہی بازار گھومنے اور خریداری کرنے اور وہاں سے رخصت ہونے کی تیاریوں میں لگے رہے۔ وہ انھیں دعوتوں اور ملاقاتوں میں یوروپ کی سائنسی ترقی اور ایجاد کے ساتھ وہاں کی تہذیب اور تاریخ کی باتیں اور وہاں کی آبادی کا بھی ذکر کرتے رہے۔علی احمد فاطمی اگلے دن کیلگری کی وادیوں کی سیر کرنے اور

وہاں کی وادیوں کی منظر کشی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کیلگری چاروں طرف وادیوں سے گھرا ہوا شہر ہے جدھر نظر اٹھا کر دیکھئے وادیاں ہی وادیاں پہاڑ ہی پہاڑ۔کئی کاریں لدی پھندی پہاڑوں کے دامن میں بنی سڑکوں اور خوبصورت کناروں کو چھوتی دوڑتی رہیں۔دونوں طرف حسین مناظر۔جھرنے طرح طرح کے پھولوں سے لدے خوبصورت پیڑ..... اور ان میں آزادی سے گھومتے اور چہکتے چرند پرند..... قدم قدم پر ہرن اور بارہ سنگھا..... ان کے اردگرد دہرے رنگ کے پانی کا تالاب..... اور اسی تالاب میں نہاتے کودتے گورے گورے انسانوں کے بچے اور بڑے اور ان کی حرکتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے جانور ادھر ہم بھی مسکرا رہے تھے کہ جہاں ڈاکٹر نوید ہوں اور لطیفے نہ ہوں ایسا ممکن ہی نہیں۔'' (۴۱)

علی احمد فاطمی نے اس اقتباس میں کیلگری کی خوبصورت وادیوں کا ذکر نہایت پرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔ اگلے صفحے میں دوسرے دن شام کو اقبال حیدر نے ''جوش لٹریری سوسائٹی کنیڈا'' کی طرف سے علی احمد فاطمی کے اعزاز میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا،جس میں ادیبوں وشاعروں اور ادب و دوستوں کو بھی بلایا گیا۔ یہاں پر ملاقاتوں اور باتوں میں سائنسی ترقی اور ایجاد کے ساتھ کنیڈا کی تہذیب اور تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ولی صاحب علی احمد فاطمی کو سینٹر دکھانے کے بعد کیلگری یونیورسٹی دکھانے لے گئے۔علی احمد فاطمی نے یونیورسٹی کی صفائی، وہاں کے طلباء و پروفیسر اور ان کی تعلیم و تہذیب کو اپنے سفرنامے میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی کیلگری کے آخری دنوں میں نگی کے ساتھ بازار گھومنے گئے اور ساتھ میں خریداری بھی کی۔انہوں نے وہاں کی زندگی ،وہاں کے لوگ، بازار، ریستوراں اور کھانے پینے کی اشیاء کا ذکر نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔اور رات کو شائستہ نے ایک الوداعی تقریب بھی رکھا،جس میں علی احمد فاطمی شریک ہوئے اور وہ محبتوں و دعاعوں سے نوازے گئے۔کیلگری کے آخر دن اقبال حیدر اور نگی ایئر پورٹ تک رخصت کرنے آئے اور علی احمد فاطمی نے بغلگیر ہوکر ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

ٹورنٹو ایئر پورٹ پر اشفاق حسین ایک بار پھر علی احمد فاطمی کو لینے آئے اور وہ ساتھ میں گھر گئے، وہاں پر نرجس

صاحبہ نے ایک بار پھر استقبال کیا۔رات کو ڈنر کا اہتمام کیا گیا جس میں نارنگ ،بیگم نارنگ ،حمایت علی شاعر اور بزمی صاحب وغیرہ بھی شریک ہوئے اور وہاں دیر تک علم وادب اور ہندوستان کے ادیبوں کی باتیں ،حیدرآباد کی باتیں اور ترقی پسند انجمن کی باتیں کرتے رہے۔

اگلے دن صبح اشفاق حسین نے ATN یعنی ایشینز ٹیلی ویژن نیٹ ورک کی طرف سے علی احمد فاطمی کا ایک انٹر ویولیا،جس کا ذکر انہوں نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔علی احمد فاطمی انٹرویو کے بعد اسٹوڈیو سے باہر اشفاق صاحب کے دفتر گئے ،وہاں پر جمال زبیری اور منظور قریشی سے ملاقات کی ۔علی احمد فاطمی کے سفر ناموں میں زیادہ تر دعوتوں اور ملاقاتوں کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔

اگلے دن صبح احسن صدیقی کے یہاں دعوت میں شریک ہوئے اور پھر احسن صدیقی کے ساتھ کنیڈا کے مشہور سی۔این۔ٹاور (Tower) گھومنے گئے ،جو کنیڈا کا ہی نہیں بلکہ دنیا کا سب سے مشہور ٹاور ہے۔یہ ٹاور دنیاں کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔علی احمد فاطمی سی۔این۔ٹاور کی خوبصورتی اور وہاں کے قدرتی مناظر کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ’’تقریباً ساڑھے گیارہ سوفٹ اونچا ٹاور اوپر جا کر گول سا ہوگیا ہے۔جس میں باقاعدہ ایک گھومتا ہوا ریستوراں ہے۔جس کا اندازہ دور سے نہیں لگایا جا سکتا ۔یہاں خاصی بھیڑ تھی۔قطار میں لگ کر داخلہ ملا۔پھر لفٹ میں داخل ہوئے اور پھر اوپر چڑھتے ہی چلے گئے۔جب لفٹ کا دروازہ کھلا تو یہاں ایک دنیا آباد تھی۔ باقاعدہ سجا ہوا دائرہ کی شکل میں ریستوراں ،سجی ہوئی میز کرسیاں ،تیزی سے گھومتے ہوئے بیرے۔اور میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ کھا پی کم رہے تھے باہر کے مناظر زیادہ دیکھ رہے تھے۔‘‘ (۴۲)

اس اقتباس میں سفر نامہ نگار نے کنیڈا کے مشہور سی۔این۔ٹاور کی خوبصورتی ،ریستوراں اور وہاں کے قدرتی مناظر کو پر لطف انداز میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی نے ٹورنٹو کی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی کاریں اور حسن وتوازن کا منظر پیش کیا ہے ساتھ ہی وہاں کی آبادی کا بھی ذکر کیا ہے۔ٹاور کی بلند پایہ عمارتوں اور خود کو ٹاور کی بلندی پر دیکھ کر علی احمد فاطمی کو اقبال کا یہ شعر یاد آیا:

عروج آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہہ کامل نہ بن جائے

علامہ اقبال کے اس شعر سے C.N.Hotel کی بلندی کی تعریف بیان کرتے ہوئے علی احمد فاطمی آگے پھر لکھتے ہیں:

''یہ انسان بھی عجیب وغریب شے ہے۔محبت کرنے پر آئے تو تاج محل بنوادے اور عداوت کرنے پر آئے تو پنٹا گن جیسی عمارت کو مسمار بھی کردے۔یہ بستیاں بساتا بھی ہے اور پل بھر میں اُجاڑ بھی دیتا ہے۔'' (۴۳)

علی احمد فاطمی نے یہ جملہ اپنے سفرنامہ ''جرمنی میں دس روز'' میں بھی درج کیا ہے۔علی احمد فاطمی اشفاق حسین، نرجس صاحبہ اور احسن صدیقی سے رخصت ہوئے اور سب کو شکریہ اور خدا حافظ کہا۔اور پھر آگے شام ۸ بجے علی احمد فاطمی کنیڈا ایئر پورٹ سے اپنے وطن روانہ ہوئے۔آگے واپسی پر کنیڈا کا جہاز جب لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ پر پہنچا تو وہاں پر ایک ایئر ہوسٹیس کا واقعہ بیان کرتے ہوئے علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

''ایک کم سن خوبصورت اور گوری چٹی سی لڑکی بڑا سا ریپر لئے فرش صاف کرنے میں مصروف تھی۔اس کا کونہ میرے پیر سے لگ گیا تھا۔میں جگ گیا تو اس نے اینٹھی ہوئی زبان سے مسکراتے ہوئے کہا ''سوری۔'' اس کا اس طرح بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کہنا اچھا لگا اور برا بھی۔پھر میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔وہ واقعی بہت کم سن تھی اور اتنی کم سن لڑکی ملازم یا ملازمہ کیسے ہوسکتی ہے؟ میری آنکھ کھل چکی تھی۔اس کو دیکھا ہی نہیں اس کے بارے میں سوچنا اچھا لگ رہا تھا۔وہ ایک بار پھر صفائی کرتے ہوئے قریب آئی تو میں نے ہمت کر کے انگریزی میں پوچھ ہی لیا۔

''کیا آپ یہاں ملازم ہیں؟''

''نہیں اس نے ایک بار مجھے دیکھا۔تھوڑا رُکی پھر ہلکی سی مسکراہت کے ساتھ بولی۔

''میں ایک طالب علم ہوں۔میں اپنے جیب خرچ کے لئے یہ کام کر رہی ہوں۔''

اور پھر پورے جوش وخروش کے ساتھ کام میں مصروف ہوگئی۔'' (۴۴)

علی احمد فاطمی نے اپنے سفرنامے میں اس واقعہ کے ذریعے پورے ممالک میں محنت کرنے کو فرضِ عین سمجھایا

ہے۔اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہاں کے لوگ اپنی فکر کرتے ہیں اور گھر کے سبھی فرد کام کرتے ہیں اور معاش کے ذریعے اپنی زندگی گزارتے ہیں۔یورپی ممالک میں کسی بھی کام کو چھوٹا نہیں سمجھتے بلکہ وہاں کام کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔

اس طرح یہ سفرنامہ تقریباً ۲۲/دنوں کے سفر کے روداد پر مشتمل ہے۔اس سفرنامے کے آخری صفحات پر انہوں نے کنیڈا سے واپسی کی روداد کے ساتھ اپنی مغربی تہذیب کو بھی پیش کیا ہے۔یہ سفرنامہ جمیل الدین عالی کے اس شعر کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

کتنی بار کئے ہیں ہم نے سات سمندر پار
گھر والی سی کوئی نہیں تھی ناریں ملیں ہزار

''یہ انوکھا دیار ہے یارو''

(تاشقند میں چندروز)

علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا مجموعہ ''سات سمندر پار'' میں شامل دوسرا سفرنامہ ''یہ انوکھا دیار ہے یارو'' (تاشقند میں چندروز) ہے۔ یہ سفرنامہ سرزمینِ ازبکستان سے متعلق ہے۔ علی احمد فاطمی نے یہ سفر پروفیسر قمر رئیس کی دعوت پر جون/۱۹۹۸ء میں اپنے استاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے ہمراہ کیا۔ انہوں نے یہ سفر غالب پر دو خطبات دینے کے غرض سے کیا تھا۔ یہ سفرنامہ بھی ۸۰/صفحات پر مشتمل ہے۔

علی احمد فاطمی نے اس سفرنامے کی ابتداء پروفیسر قمر رئیس کی معرکہ آرا کتاب ''ازبکستان: انقلاب سے انقلاب تک'' سے کیا ہے۔ یہ سفرنامہ ازبیکی کے ممتاز شاعر حمید عالم جان کی نظم سے شروع ہوتا ہے۔ اس نظم کا مصرع یہ ہے:

یہ انوکھا دیار ہے یارو

علی احمد فاطمی نے اسی مصرعے کو اپنے اس سفرنامے کے عنوان کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس سفرنامے میں انہوں نے قمر رئیس اور تاشقند کے بارے میں اور ان سے اپنے تعلقات کے بارے میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اور پھر آگے وجوہاتِ سفر اور سامانِ سفر کی روایتی باتوں کو استدلال کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اس سفرنامے کی ابتداء سے ہی علی احمد فاطمی کا دلکش اندازِ بیان نظر آنے لگتا ہے اور وہ قاری کو سفر کی ابتداء سے ہی محظوظ کرانے لگتے ہیں۔

علی احمد فاطمی اور سید محمد عقیل رضوی ۱۵/جون ۱۹۹۸ء کو ۱۵/دنوں کے ویزے کے ساتھ دہلی سے تاشقند کے لیے روانہ ہوئے۔ اور ڈھائی گھنٹے فلائیٹ کے سفر کے بعد ۳/بجے دن میں تاشقند ایئرپورٹ پہنچے لیکن ایئرپورٹ پر انہیں کوئی رسیو کرنے نہیں آیا۔ وہ لوگ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ۳/گھنٹے تک تاشقند کی شاہراہوں پر گھومتے رہے لیکن انڈین کلچر سینٹر، موسیٰ جلیل اسٹریٹ نہیں ملا۔ علی احمد فاطمی اس پریشانی کے عالم میں بھی اپنے اس سفرنامے میں دلکشی اور دلجوئی کا سامان بنائے رکھتے ہیں۔ علی احمد فاطمی تاشقند کے حالات وہاں کی خوبصورت دوشیزاؤں کا بیان، سڑکوں، عمارتوں، برقی بس نما لوکل ٹرینوں کے بیان کے ساتھ بیچ بیچ میں سید محمد عقیل رضوی کی پریشانی اور اپنی بے چینیوں کا بھی ذکر کرتے

ہوئے نظر آتے ہیں۔ایسا واقعہ اس لیے پیش آیا کیوں کہ ان کے آنے کی خبر قمر رئیس کو نہیں تھی۔تاشقند مرزا غالب کے اجداد کا بھی وطن ہے اور اس وقت وہاں غالب صدی منائی جا رہی تھی۔علی احمد فاطمی بھی اسی سلسلے میں وہاں تشریف لے گئے تھے۔

علی احمد فاطمی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھے ہی بیٹھے پورے شہر کا محاسبہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔انہوں نے تاشقند کے الگ الگ مناظر کے ذریعے ان سب واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی تاشقند کی تہذیب و کلچر بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اسلام علیکم اور رحمت'' جو شکریہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہم ایک مسلم مملکت میں داخل ہوئے ہیں لیکن اس کے علاوہ کوئی آثار اسلامی نہ تھا۔نہ مسجد کا کوئی مینار ،نہ کوئی ہرا جھنڈا ،نہ چاند ستارا۔اور نہ ہی لباس۔''
> (۴۵)

علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ نئے ملکوں میں سب سے پہلے زبان کی پریشانی ہوتی ہے۔اس پریشانی کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ہم اتنا پڑھ لکھ کر بھی گونگے بنے بیٹھے ہیں۔آخر کار چلتے پھرتے ان کو قمر رئیس مل ہی گئے سکون اور مسرت ہوئی۔قمر رئیس کے ہمراہ علی احمد فاطمی گھر گئے وہاں بیگم قمر رئیس ،بیٹی گلسرا، داماد مجیب اور نواسہ شمائل سے ملاقات ہوئی۔علی احمد فاطمی تاشقند کی سیر و تفریح کا ذکر کرتے ہوئے مذکور ہیں:

> ''تاشقند کی پہلی شام۔چاروں طرف پھلدار درخت،ہلکی ہلکی سی خنکی اور ٹھنڈی ہواؤں کا لطف لیتے ہوئے ہم قریب کے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن پہنچے جس کا نام حمید عالم جان تھا۔شاعر کے نام پر اسٹیشن،ہمیں اسی پر حیرت ہوئی۔اس کی شاعری کی طرح چمکتا دمکتا اسٹیشن اور پھر اتنی ہی صاف ستھری میٹرو اور اس میں جگ مگ کرتا ہوا ماحول۔طرح طرح کے رنگ برنگے چہرے۔حسین و جمیل چہروں سے جھلکتا ہوا ماحول۔بس نظریں چوندھیا گئیں۔'' (۴۶)

علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں تاشقند کا قدرتی اور مصنوعی ماحول اور وہاں کی ترقی کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہاں کے موسم سے واقف کراتے ہوئے وہاں کی شام کا حسین نقشہ بھی پیش کیا ہے۔

اگلے دن قمر رئیس علی احمد فاطمی کو ''انڈین کلچر سینٹر، موسیٰ جلیل اسٹریٹ'' لے کر گئے۔ سینٹر میں اس دن اردو اور ہندی استادوں کی ایک چھوٹی سی تقریب تھی، تقریب کے بعد سینٹر ہال میں طعام کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ علی احمد فاطمی ازبکی غذا کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''تمام اساتذہ اپنے اپنے ساتھ کھانے کا سامان لائے تھے۔ میز پر پھل سجا دیئے گئے ۔مشروبات لگ گئے۔ روٹیاں اور ٹافیاں بھی تھیں۔ اور گرم گرم بغیر دودھ اور شکر کی چائے بھی۔ اس Combination کو ہم سمجھ نہ سکے۔ لیکن جیسا دیش ویسا بھیس ہم خوبانی کھاتے رہے۔ اور روکھی پھیکی چائے پیتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ازبکی پلاؤ تیار ہو کر آ گیا۔ جو یہاں کی خاص ڈش ہے۔ بڑی سی قاب میں پیلے پیلے رنگ کا پلاؤ جس کے اوپر سوکھے سوکھے گوشت کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے جیسے ہی چکھا بے حد لذیز نکلا اور ہم نے سیر ہو کر پلاؤ کھایا اور سب کے ساتھ چائے پی۔ پانی پینے کو نہ ملا۔ کوک سے کام چلانا پڑا۔ کھانے کے بعد سب نے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگیں۔'' (۴۷)

علی احمد فاطمی کے سفرناموں میں کھانے کے ساتھ ساتھ عورتوں کا حسن و جمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی نزاکت و انداز، عادات و اطوار اور طور طریقے کو بھی بڑی جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور پھر آگے ازبکی معاشرت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہاں غربت بہت زیادہ ہے، اور وہاں کی کرنسی ''سوم'' ہے، جو ہندوستانی روپیوں سے بھی چھوٹی ہے اور غربت کی وجہ سے بدعنوانیہ اور کرپشن بھی بہت زیادہ ہے۔ ایک جگہ بازار کا نقشہ کھینچتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> ''بازار عورتوں سے بھرا پڑا تھا شاید اس کا سبب یہ بھی ہو کہ ازبکستان میں عورتوں کی آبادی مردوں سے زیادہ ہے۔ ایسا ہمیں بعد میں معلوم ہوا۔ عورتیں بالٹیوں میں پھل خشک میوے، روٹی وغیرہ بیچ رہی تھیں۔'' (۴۸)

سفرنامہ نگار نے اس اقتباس میں بازار اور عورتوں کا ذکر نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ علی احمد فاطمی اپنے سفرناموں میں عورت کو ایک خاص مقام دیتے ہیں۔ انہیں کبھی کوئی عورت اپنے خرچ کے لیے کام کرتی ہوئی ملتی ہے، تو کوئی عورت میوے اور سبزیاں بیچتے ہوئی، تو کہیں برقی بسوں کی ڈرائیوری اور کنڈکٹری کرتی ہوئی نظر آتی ہیں،

جس کوانھوں نے اپنے سفرنامے میں اہم مقام عطا کیا ہے۔

اگلے دن صبح علی احمد فاطمی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کے استاد تش مرزا کے گھر تشریف لے گئے، وہاں تش مرزا اور ان کے خاندان کے افراد نے ان کا استقبال کیا اور یہیں پر انصار حسین اور بیات صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور ساتھ میں طعام اور تش مرزا کی مہمان نوازی کا ذکر کرتے ہوئے لطیفے بھی سناتے رہے۔

قمر رئیس اگلے دن داداخاں نوری سے وعدے کے مطابق علی احمد فاطمی کو ڈاچا گھمانے لے گئے۔ چونکہ علی احمد فاطمی کا یہ سفرنامہ ادبی نوعیت کا ہے اس لیے اس میں ادیبوں کی زبان کثرت سے ملتی ہے۔ علی احمد فاطمی تاشقند کے ادیبوں اور ان کے ڈاچا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاچا شہر سے دور واقع اس فارم ہاؤس کو کہتے ہیں جہاں اکثر لوگ چھٹیوں میں جا کر آرام کرتے ہیں، پکنک مناتے ہیں، عام طور پر یہ ڈاچے شہر سے دور کسی پُر فضا مقام پر ہوتے ہیں۔ پہاڑیوں کے دامن میں آبشاروں کے نزدیک۔ پتہ چلا کہ ادیبوں و شاعروں کو حکومت کی طرف سے یہ زمین دی جاتی ہے تا کہ وہاں آرام کریں اور تخلیق کریں اور پھر وہ اپنے ڈاچے کو اپنے طور پر خوبصورتی سے تیار کرتے ہیں۔ داداخان نوری ادیب ہیں اس لئے ان کے پاس بھی ڈاچا ہے۔'' (۴۹)

علی احمد فاطمی اگلے دن صبح ۹ر بجے داداخان نوری کی گاڑی سے ڈاچا کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے سفر کے دوران داداخان کے سبزیاں اور گوشت خریدنے اور ایک بازار کا بھی ذکر کیا ہے جہاں لوگ دال، چاول، روٹی، گوشت، سبزی اور پھل وغیرہ فروخت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علی احمد فاطمی ڈاچے پر جاتے ہوئے سفر میں قدرت کے خوبصورت مناظر کو پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''اب پہاڑ شروع ہو گئے تھے۔ دھوپ رخصت ہو رہی تھی۔ چاروں طرف بادلوں کے ٹکڑے منڈرا رہے تھے۔ داداخان نے موسم کی مناسبت سے کار میں رفیع کے نغموں کا کیسٹ لگا دیا۔'' (۵۰)

علی احمد فاطمی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے سفر کے بعد داداخان نوری کے ڈاچا پر پہنچے۔ داداخان علی احمد فاطمی کو اپنے ڈاچا میں لے گئے جہاں سیب، شفتالو، خوبانی، چیری اور اسٹرابیری وغیرہ کے پیڑ لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے خوبانی اور

چیری توڑیں اور خوب سیر ہو کر مزے سے کھائے۔ دادا خان نوری علی احمد فاطمی، قمر رئیس اور عقیل صاحب کی میز بانی میں لگے رہے۔ علی احمد فاطمی نے ڈاچا کے خوبصورت مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے:

''چاروں طرف پہاڑ کی چوٹیوں پر لہراتی ہوئی سفید ناگن کی طرح برف دکھائی دے رہی تھی اور نیچے چھوٹی سی آبادی ایک طرح کے بنے ہوئے گھر۔ ایک عجیب دلربا اور ہوش ربا منظر۔'' (۵۱)

آگے پھر اقتباس میں علی احمد فاطمی نے ڈاچا کے باہر حسنِ فطرت کے مناظر کو اس طرح قلم بند کیا ہے:

''ہم لوگ ڈاچا سے باہر نکل کر پہاڑی کی طرف چڑھنے لگے۔ پہلو میں کولتار کی ایک پتلی سی سڑک بل کھاتی ہوئی نشیب میں چلی گئی تھی اس کے دونوں طرف گہری کھائیاں تھیں کہیں اوپر سے پانی کا باریک سا چشمہ اپنے مٹ میلے پانی کے ساتھ گھنگھروؤں کی سی آواز کرتا ہوا نیچے کی طرف بہتا چلا جا رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اور کھلے کھلے ہرے بھرے ماحول میں ہم اپنے آپ کو آزاد پرندے کی طرح محسوس کر رہے تھے۔ ہم چلے پھرے ٹہلے اور شاید اُڑے بھی پھر تھک گئے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر خچر اور دیگر جانور آرام سے جگالی کرتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گھٹا گھر گئی اور ہم جلدی سے ڈاچا کی طرف مڑ پڑے اور پھر بارش آ گئی۔'' (۵۲)

سفر نامہ نگار نے اس اقتباس میں ڈاچا کے خوبصورت مناظر کو پر لطف انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے حسنِ فطرت کے مناظر، کھلے میدان میں گھٹاؤں کا گھرنا اور بارش دور سے صاف آتے دکھائی دینا ان سب کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ علی احمد فاطمی حسنِ فطرت کے اچھے ناظر اور پارکھ ہیں اور بے لوث عاشق بھی۔ اسی لیے انہوں نے اس سفر نامے میں بڑی جزئیات کے ساتھ ایک ایک منظر کو ترتیب وار بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس سفر نامے میں جھیل، ٹھنڈا پرسکون سفر، یادگار ڈاچا کا دلکش ماحول، دادا خان کی میز بانی و پلاؤ کا ذائقہ، خوبصورت فطری مناظر اور قمر رئیس کی مزیدار باغ و بہار شخصیت کا ذکر نہایت سلیقہ مندی سے پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے اگلے ہی صفحے میں اتوار کے دن، ناشتہ اور چائے کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی اردو زبان کے مسائل اور بگڑتے ہوئے تہذیب کو بھی پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس سفر نامے میں برقی بسوں اور ٹراموں کو چلاتی ہوئی

عورتوں کا بھی ذکر بخوبی کیا ہے۔سبھی محنت کش اپنے کام میں مصروف ہیں کسی کو بلاوجہ گپ لڑاتے اور کوئی کسی سے لڑتا جھگڑتا بھی نہیں ہے۔علی احمد فاطمی نے اس سفرنامے میں تاشقند کے ہوٹل، علی شیر نوائی ٹھیٹر اور ریستوراں کا بھی ذکر کیا ہے۔

علی احمد فاطمی ۲۲/جون دوشنبہ کے دن شاہد تسلیم کے ساتھ تاشقند کے ایک مشہور بازار'' چارسوٗ'' گھومنے گئے۔ ابھی وہ بازار کے کنارے آہی رہے تھے کہ اچانک دو ازبکی پولس نے انہیں روک لیا۔علی احمد فاطمی اور سید محمد عقیل رضوی کے پاس تاشقند پولس رجسٹریشن رسید نہ ہونے کی وجہ سے ازبکی پولس انہیں پولس اسٹیشن لے گئی۔علی احمد فاطمی اس واقعہ کو بڑے ہی ڈرامائی عناصر کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پولس کے نوجوانوں نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا ہمیں اور بھی خوشی ہوئی اور ہم نے متانت کے بجائے تمکنت سے ہاتھ ملایا۔چھوٹتے ہی انہوں نے پوچھا۔''پوکستانی یا ہندوستانی؟'' عجب انداز سے منھ گول کر کے سوال کیا۔''ہندوستانی''ہم نے بھی اسی طرح منھ گول کرنے کی کوشش کی۔
>
> ''او..... پاسپورٹ؟''
>
> ہم نے بڑے اعتماد سے اپنے اپنے پاسپورٹ دیکھائے۔میرا پاسپورٹ دیکھتے ہوئے ایک پولس والا بولا''علی احمد فاطمی''
>
> ''جی..... فاطمی''
>
> ''عاقل رضوی''
>
> ''جی میں ہوں۔''عقیل صاحب نے بڑے ادب سے کہا۔'' (۵۳)

انھوں نے اس اقتباس میں تاشقند کے پولس، وہاں کے سخت قانون اور ساتھ ہی ادب وتہذیب کو بھی پیش کیا ہے۔اس پورے مکالمے میں ایک عجیب طریقے سے تلفظ کی ادائیگی کی گئی ہے۔ایک غیر اردو داں کس طرح اردو کا تلفظ استعمال کرتا ہے اس کا ایک خوبصورت نمونہ علی احمد فاطمی نے اس سفرنامے میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے آگے اس سفرنامے میں ازبکی کے عظیم شاعر شیر نوائی کے حالات کو بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس کے دیوان کے اشعار کو بھی نقل کیا ہے۔اس سفر میں انہوں نے آگے تاشقند کی تاریخی اہمیت اور وہاں کی آبادی کا

طول وعرض بیان کیا ہے، جو ایک علمی ومعلوماتی بیان ہے۔اس سفرنامے میں علی احمد فاطمی کے ساتھ دو استاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی اور پروفیسر قمر رئیس کے ہونے کی وجہ سے علم وزبان پر گفتگو اور شعر وشاعری کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔اس لیے اس سفرنامے میں ادبیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ ۲۴ رجون کو قمر رئیس نے ہمارے لیے سینٹر میں غالب لکچر کا اہتمام کیا۔اس پروگرام میں عقیل رضوی اور علی احمد فاطمی نے اردو میں غالب کی انسان دوستی اور تصّورِ عظمت انسان پر تقریر کی۔اس سفرنامے میں ترقی پسندی کا عنصر بھی دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ ازبکستان کی آزادی، ترقی اور جدید ٹکنالوجی کا سہرا روس کو جاتا ہے۔اور ازبکستان ۱۹۱۷ء کے بعد سے ہی ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔علی احمد فاطمی ازبکستان کی ترقی کے بارے میں مذکور ہیں:

''یہی حال شہر کے نوجوانوں کا ہے وہ دن کو کہیں کام کریں گے تو رات کو کہیں اور جفا کشی۔عرق ریزی ان کے محبوب مشغلے ہیں۔وہ کسی کام میں شرم محسوس نہیں کریں گے۔پہاڑی اور پتھریلے مقامات ہونے کی وجہ سے یہاں کی قومیں جفاکش تو تھیں ہی روسیوں نے محنت ومشقت کے نئے نئے پیغام دیئے اور اشتراکیت کی روشنی پہنچائی جس سے یہ قوم اور بھی نکھر گئی۔'' (۵۴)

علی احمد فاطمی نے اس اقتباس میں روسیوں کی مدد سے ازبکستان کے گاؤں کے ساتھ شہری زندگی اور عوام کی بیداری کو بھی پیش کیا ہے۔اور اس میں انہوں نے مارکسی نظریہ فکر کو بھی پیش کیا ہے۔آگے اقتباس میں ازبکستان کے اقتصادی حالات کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''قمر صاحب جس فلیٹ میں رہتے ہیں وہ ایک آرمینین خاتون کا ہے جس سے وہ گیارہ سو ڈالر ماہانہ کماتی ہے یعنی تقریباً ۴۵ ہزار روپئے ماہانہ، دوسری طرف قمر صاحب نے اپنے دفتر کے ایک نوجوان دلشاد سے ملایا جو ایم۔بی۔بی۔ایس ہے۔ رات میں ہسپتال میں ڈیوٹی کرتا ہے اور دن میں سینٹر میں کلرکی۔اس طرح ایک لڑکی البینیائی جو ریسرچ اسکالر ہے، سینٹر میں رقص سیکھ رہی ہے اور ہفتہ میں دو تین بار آکر قمر صاحب کے گھر کی صفائی بھی کرتی ہے۔تاشقند میں زیادہ تر ایسے گھرانے ہیں جہاں مرد، عورت، لڑکیا، سبھی کام کرتے ہیں تب جا کر ایسی غیر معمولی اقتصادی بدحالی

اور معاشی پیچیدگی کا سامنا کر پاتے ہیں اور شاید اسی لئے ازبکستان میں ابھی بھی
مشترکہ خاندان کا تصور قائم ہے تاکہ کئی لوگوں کی آمدنی گھر آسکے اور خرچ برداشت
ہو سکے۔'' (۵۵)

علی احمد فاطمی نے اس اقتباس میں ازبکستان کی عوام کے کام کرنے کا انداز اور محنت کش طبقہ کی کمائی اور اقتصادی ، بدحالی اور معاشی پیچیدگی کو پیش کیا ہے۔تاشقند کے گھروں میں ہر مرد کام کرتے ہیں، جس سے ان کی اقتصادی پریشانی دور ہوتی ہے اوران کا گزربسر آسانی سے ہوتا ہے۔

۲۵/جون کو اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ میں علی احمد فاطمی کا استقبال ہوا اور اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ میں ہی اساتذہ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں اور وہاں کے کلاس روم اور لائبریری وغیرہ کو بھی دیکھا۔علی احمد فاطمی آگے البیرونی میوزیم گئے اور وہاں البیرونی میوزیم کے بارے میں بیش قیمتی معلومات بھی فراہم کیں۔اور شعبۂ مخطوطات دیکھا، جس میں طرح طرح کے مخطوطے الماریوں اور بند شیشے کی میزوں پر رکھے گئے تھے۔

علی احمد فاطمی ۲۶/جون کی صبح چائے پینے کے بعد فرصت واطمینان کے لمحوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین ادب اور ترقی پسندی پر کھل کر باتیں کی اور ساتھ ہی ساتھ ''نیا سفر'' کے مزاج ، مذاق پر تبادلۂ خیال کیا اور کبیر و جوش پر پروگرام بھی ترتیب دیئے۔اسی دن سینٹر میں ہندوستانی لباس کے منصوبے پر ایک خاتون کا لکچر تھا، جس میں علی احمد فاطمی شریک ہوئے اور وہاں پر تمام لوگوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔لکچر میں ابھی دیر تھا علی احمد فاطمی کھانا کھائے اور چائے پی کر سینٹر کے باہر گھومنے نکلے۔سینٹر کے باہر پاس پڑوس کے مکانات کا نقشہ کھینچتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہاں اونچی عمارتوں والے مکان نہ تھے بلکہ چھوٹے برک سے بنے ہوئے ہر مکان
کے سامنے پیڑوں کا ہونا ضروری خوبانی، چیری کے پیڑ اور ان سب میں لدے ہوئے
پھل جیسے ہمارے یہاں آم امرود اور بیر کا پیڑ۔ایک گھر کے سامنے کچھ عورتیں اور
بچے بالٹیاں لئے اور چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کے ذریعہ پھل توڑ رہے تھے۔میں ان
کے قریب گیا۔مجھ جیسے اجنبی کو دیکھ کر وہ ذرا بھی گھبرائے نہیں بلکہ الٹا تپاک سے
سلام علیکم کہا اور اشاروں میں پھل کھانے کی دعوت دی۔میرے ہاتھ میں کیمرا تھا
میں نے تصویر کھینچنے کا اشارہ کیا۔سب بے حد خوش ہوئے۔بچے اپنے آپ کو درست
کرنے لگے عورتیں اپنا اسکارف ٹھیک کرنے لگیں اور ہم نے ان کی تصویر کھینچ لی۔وہ

خوش ہوئے اور بدلے میں مٹھی بھر چیری کے پھل دیئے۔'' (۵۶)

سفر نامہ نگار نے مذکورہ بالا اقتباس میں تاشقند کے ہر مکان کے سامنے چیری اور خوبانی کے پیڑ کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی وہاں کی آب و ہوا اور ازبکستان کی دیہی تہذیب کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

اس سفرنامے میں آگے تاشقند کی برہنہ تہذیب پر غور و فکر کرتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے برہنگی رخصت ہوئی لیکن یہ تو مسلمانوں کا ملک ہے، یہاں پوشیدگی کیوں نہیں؟ یہاں اسلامی تہذیب کیوں نہیں؟ پھر اس کا جواب خود ہی تلاش کرتے ہیں کہ یہاں مدتوں تک روس کی حکومت رہی ہے اس لیے ایسا ہوگا۔ علی احمد فاطمی نے اس سفرنامے میں آگے لکچر کا بیان اور اس کی پوری تفصیل کو پیش کیا ہے اور عقیل رضوی کی تقریر کو بھی نقل کیا ہے، جس کا موضوع تھا ''ہندوستانی لباس''۔ اس سفرنامے میں علی احمد فاطمی نے ہندوستان اور تاشقند کے لباس کا موازنہ کیا ہے۔ علی احمد فاطمی تاشقند کے ایک پارک اور لباس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تاشقند کے ایک صاف ستھرے اور دمکتے ہوئے چوراہے پر جہاں ایک طرف پارک میں پشکن کا مجسمہ لگا ہوا ہے اس کے ٹھیک سامنے فوارے اچھل رہے تھے۔ فواروں کے پانی میں بچے نہا رہے تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بے حد حیرت اور مسرت ہوئی کہ انھیں کے درمیان ایک حسینہ صرف اُنگل بھر کے کپڑے پہنے فواروں میں بچوں کے ساتھ نہا رہی تھی، بدن پر لباس برائے نام تھا۔ ہم نے غور سے دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہے۔ آنکھیں چودھیا گئیں۔ اُف اتنا باریک لباس، نرم و نازک دھوپ میں دمکتا ہوا چاندی جیسا بدن۔'' (۵۷)

انھوں نے اس اقتباس میں تاشقند کے لباس اور تہذیب و کلچر کو پیش کیا ہے۔ آگے عقیل رضوی کا جملہ بھی رقم کیا ہے کہ ''اچھے لباس کے اپنے مزے ہیں اس سے شخصیت سجتی اور سنورتی ہے۔''

علی احمد فاطمی ۲۷/جون کو صبح ۷/بجے ایمبسی کے ائرکنڈیشن گاڑی سے سمرقند کے لیے روانہ ہوئے۔ اور راستے میں مختلف مقامات جیسے مدرسہ ابوالقاسم، علی شیر نوائی پارک اور پارلیمنٹ کے ساتھ ساتھ سفر کا موسم اور دلکش مناظر، چوڑی اور صاف ستھری سڑکیں اور تیزی سے بھاگتی ہوئی کاریں اور عقیل رضوی و قمر رئیس کی مزاحیہ و شاعرانہ محفل کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔ وہ لوگ اس سفر میں ادبی مزاح پیدا کرتے ہوئے جاتے ہیں، جسے علی احمد فاطمی نے تفصیل سے بیان کیا ہے

اوران کے اشعار کو بھی نقل کیا ہے۔اس سفرنامے میں ادبی اڈے بازی اور ادبی مباحثہ بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔علی احمد فاطمی جہاں ادبی چشمکوں کا بیان کرتے ہیں وہیں راستے میں ملنے والی دوشیزاؤں کے ذکر کے ساتھ بچوں کے کھیلنے، کودنے کے انداز اوران کے چلبلے پن کو دکھانے سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔

اس سفرنامے کے آخر میں سمرقند کی پوری روداد دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہاں کی جغرافیائی کیفیت،تاریخی اہمیت، تہذیب وتمدن کو بڑی عرق ریزی سے بیان کیا گیا ہے۔سمرقند میں ریستوراں کے نام بڑے دلچسپ ملتے ہیں جیسے: غزل،تبسم،زرافشاں اورگلستاں وغیرہ۔سمرقند کو شاعروں وفنکاروں اورتاریخ وتہذیب کا مرکز کہا جاتا ہے۔علی احمد فاطمی نے سمرقند کے تاریخی وتہذیبی مرکز کو دیکھتے ہوئے آج کے حالات کواس طرح پیش کیا ہے:

''تاریخی شہر سمرقند نظامی وغیرہ کا شہر سمرقند۔فارسی شاعری کا مرکز سمرقند۔تہذیب وتمدن کا مرکز سمرقند لیکن نیا شہر صنعت وحرفت میں ڈھل چکا ہے۔کالے کالے دھوؤں کی لپیٹ میں ہے جہاں گل وبلبل چہکتے تھے۔عشق ومحبت کے نغمے گائے جاتے تھے۔فارسی شاعری کا طوطی بولتا تھا۔آج وہاں کارخانے کا سائرن بولتا ہے۔ بڑے بڑے ٹرکوں،ٹریکٹروں کی آوازیں گونجتی ہیں۔'' (۵۸)

سفرنامہ نگار نے اس اقتباس میں تاشقند کی تہذیبوں کا اتار چڑھاؤ،ٹکنالوجی کی ترقی اور اس کے فوائد و نقصانات کے اسباب کونہایت چابکدستی سے پیش کیا ہے۔اس سفرنامے میں آگے علی احمد فاطمی اپنے قافلہ کے ساتھ سب سے پہلے ''شاہ زندہ'' (حضرت قشم بن عباس کا مقبرہ) دیکھنے گئے، جورسول اللہؐ کے چچا عباس کے بیٹے تھے۔اس کے بعدان کے قافلے نے مدرسہ ریگستان کو بھی دیکھا۔اگلے صفحے میں علی احمد فاطمی اپنے قافلے کے ساتھ تیمور خاندان کے مقابر کو دیکھنے گئے۔اس میں اسلامی تاریخ کی تفصیل ملتی ہے۔اور پھر اپنے قافلے کے ساتھ الغ بیگ کی رصدگاہ دیکھنے گئے، جوامیر تیمور کا پوتا تھا۔اس سفرنامے میں انہوں نے امام اسمٰعیلؑ کا ہونے والا جشن،امیر تیموراورشیرنوائی مجسمے وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہےاورساتھ ہی بادشاہوں کے تاریخی پہلوؤں کو بھی نمایا کیا ہے۔علی احمد فاطمی مزارات کے باہر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غریب عورتیں اپنی گود میں ننگ دھڑنگ بچے لئے ازبکی زبان میں بھیک مانگنے لگیں، بالکل پیچھے ہی پڑگئیں نظام الدین اولیاء کا سا منظر۔کسی طرح ہم نے پیچھا

چھڑایا اور باہر نکل پڑے۔'' (۵۹)

علی احمد فاطمی نے آگے سمرقند بازار سے خریداری کا ذکر کیا ہے۔اور پھر آگے بڑھے تو علی احمد فاطمی نے سمرقند یونیورسٹی دیکھا، جہاں طلباء اور طالبات بکھرے ہوئے تھے۔وہاں دائیں جانب یونیورسٹی بائیں طرف University of World Languages قائم ہے۔ان دونوں کے درمیان میں امیر تیمور کا شاندار مجسمہ کھڑا ہے۔اب ان کا قافلہ سمرقند سے تاشقند کے لیے روانہ ہوا۔علی احمد فاطمی سمرقند کی واپسی پر وہاں کی تعریف بیان کرتے ہوئے مذکور ہیں:

''ہماری گاڑیاں ایک بار پھر سمرقند کی ان گلیوں اور سڑکوں کی طرف بھاگنے لگیں جدھر سے ہم آئے تھے۔ایک بہت یادگار اور تاریخی دن ہم نے اس تاریخی شہر میں گزارا۔''
(۶۰)

اور آگے پھر واپسی پر سمرقند کے پہاڑوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہماری کار پہاڑ کے نشیب سے گزر رہی تھی۔پہاڑ کی وادیوں میں لہراتی ہوئی سڑک اور ڈوبتا ہوا سورج۔ہم اس وادی میں اتر گئے یا شاید وادی ہمارے قلب وجگر میں اتر گئی۔خوبصورت مناظر کا جادو ہم سب پر چل گیا تھا۔'' (۶۱)

علی احمد فاطمی سفر سے واپسی کے وقت اگلے دن ۲۸ر جون اتوار کو آرام کرنے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند فکر کے تازہ ترین مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔علی احمد فاطمی نے پھر کئی پروجیکٹ تیار کئے، جس میں پہلا پروجیکٹ تھا جنوری ۱۹۹۸ء میں کبیر اور جوش پر سیمنار کرنا اور دوسرا پروجیکٹ ترقی پسند ادب کے معماروں کی کئی جلدیں تیار کرنا اور پھر اسے شائع کرنا۔شام کے وقت علی احمد فاطمی اپنے قافلے کے ساتھ محیا رحمانوا کے گھر کھانے پر گئے، جہاں پر لوگوں سے ملاقات کی اور ساتھ میں طعام کیا۔علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے کے آخر میں ملاقاتوں اور دعوتوں کا ذکر خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اس طرح یہ سفرنامہ اختتام کو پہنچا۔

علی احمد فاطمی اگلے دن صبح تاشقند سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔اگلے ہی پل دہلی کے ایئرپورٹ اور وہاں کا ماحول اور گذشتہ تمام واقعات تاریخ بن کر ان کے ذہن میں گونجنے لگے۔اور یہی گونج اضطراب و بے چینی ان کے تاریخی واقعہ کو بیان کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے۔

علی احمد فاطمی کا یہ سفرنامہ ادبی نوعیت کا ہے۔انہوں نے یہ سفر سیر وتفریح اور گرمیوں کی چھٹی کے لیے کیا تھا۔

اسی لیے اس سفرنامے میں سیر وتفریح کے زیادہ مقامات نظر آتے ہیں۔ان کے اس سفرنامے میں پہاڑ، ندیاں، سمندراور جھیلوں کا ذکراوراس کے آس پاس عوام کے جمگھٹ ، بازاروں، سڑکوں، ہوٹلوں اور جدید ٹکنالوجی کے نئے آلات کا ذکر ہمیں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ان سب کے علاوہ انہوں نے اس سفرنامے میں تاشقند کی غذا، چیری، خوبانی کے درخت، چائے اورازبیکی بریانی کودلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے اس سفرنامے میں شخصیت کا ذکربھی دیکھنے کو ملتا ہے، جو بہت اہم ہے۔کل ملا کرہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سفرنامے میں کہیں تاریخ ہےتو کہیں قدرتی مناظرکی عکاسی اورکہیں انسانی ترقی کے اسباب وآلات۔ان سب خصوصیات کوعلی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔اوران کی اہمیت کوبھی واضح کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں تاشقند کے سماجی، سیاسی، اوراقتصادی حالات کو بیان کرتے ہوئے جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔انہوں نے اس سفرنامے میں وہاں کی عورتوں کے حسن و جمال، لباس اوررہن سہن کا ذکر بڑی باریک بینی سے کیا ہے۔جس سے ہم کہہ سکتے ہیں یہ ایک کامیاب سفرنامہ ہے، جوقاری کودلچسپی کا سامان مہیا کراتا ہے۔قاری اس سفرنامے کابغیراکتاہٹ محسوس کیے ابتداء تاانتہاایک ہی نشست میں مطالعہ کرسکتا ہے۔اس سفرنامے میں طنز وظرافت کے ساتھ جمالیات اورحقیقت بیانی کا رنگ غالب نظرآتا ہے۔اس سفرنامے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا مطالعہ گہرااورتجربہ عمیق ہے۔

جرمنی میں دس روز

علی احمد فاطمی کا چوتھا سفر نامہ ''جرمنی میں دس روز'' ہے۔ جیسا کہ سفر نامے کے عنوان سے ہی واضح ہوتا ہے کہ اس سفر نامہ میں جرمنی کے دس روز کی روداد کو قلمبند کیا گیا ہے۔ علی احمد فاطمی ۱۹/ جولائی ۲۰۰۷ء کو دہلی سے روس کی جہاز سے جرمنی کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے جرمنی سے واپسی پر اس دس روز کے سفر کی روداد کو ۹۲/ صفحات پر مشتمل کتابی شکل میں راجیو آفسٹ، الہ آباد سے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔ علی احمد فاطمی نے اس سفر نامے کا انتساب عارف نقوی کے نام کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے یہ سفر ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا۔ جرمنی کے ''انجمن اردو'' نے ۲۱/ جون ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ۱۵۰/ ویں سالگرہ کے موقع پر آزادی کے غازیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک سیمنار کا اہتمام کیا تھا۔ ہندوستان سے علی احمد فاطمی کو بھی اس سیمنار کے لیے مدعو کیا گیا۔ سیمنار کا موضوع تھا ''بہادر شاہ ظفر اور جنگ آزادی''۔ علی احمد فاطمی نے جرمنی کا سفر اپنے بزرگ دوست ترقی پسند نقاد عارف نقوی کی دعوت پر کیا تھا اور انھیں کے اصرار پر یہ سفر نامہ بھی تخلیق کیا۔ وہ خود اس سفر نامہ کی ابتدائیہ ''دو باتیں'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس سال گرمی کی چھٹیوں میں شکاگو کی چوتھی عالمی کانفرنس میں شرکت کر کے لوٹا ہی تھا کہ دس روز کے لئے جرمنی جانا پڑا۔ وہاں کی اردو انجمن اور اس کے سربراہ ترقی پسند شاعر و دانشور عارف نقوی صاحب نے بڑی محبت سے مدعو کیا۔ جرمنی میں قائم انڈین ایمبسی کی کلچر سکریٹری نے بھی مدعو کیا۔ ان دونوں کی کوششوں سے آئی۔ سی۔ سی۔ آر۔ انڈیا نے مجھے سرکاری سطح پر روانہ کیا۔ جرمنی پہلی بار گیا تھا۔ تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے جرمنی امیریکہ کنیڈا سے قدرِ مختلف ہے۔ اس لئے کچھ لکھنے کی خواہش ہوئی۔'' (۶۲)

علی احمد فاطمی نے اس سفر نامے میں جرمنی سفر کے دوران وہاں کی تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشی اور علمی و ادبی حالات کا مشاہدہ بغور کیا ہے۔ ان کا یہ اعتراف ہے کہ کسی بھی بڑے ملک کی تاریخ و تہذیب کو سمجھنے کے لیے دس دن کافی

نہیں ہوتے۔صرف ایک شہر میں رہنا اور کاروں میں گھومنا بھی کافی نہیں ہوتا۔لیکن ایک حساس ادیب کے لیے دس روز کا سفر بھی اہمیت کے حامل ہوتا ہے۔اس کی گواہی یہ سفر نامہ دے رہا ہے۔تاہم اس مختصر وقت میں چلتے پھرتے گھومتے جو بھی دیکھا سمجھا اور محسوس کیا وہ سب اس سفر نامے میں پیش کر دیا ہے۔

علی احمد فاطمی کا یہ سفر ۱۸/جولائی ۲۰۰۷ء کو شروع ہوا اور جہاز میں عارف نقوی کی تازہ ترین کتاب ''نقوش آوارہ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے سفر پورا ہوا۔اس کتاب میں عارف نقوی کے پہلی بار جرمنی جانے کا واقعہ درج ہے۔ عارف نقوی نے اس میں اپنے اور جرمنی کے رشتے کے بارے میں لکھا ہے،جس کے مطالعے سے علی احمد فاطمی کو جرمنی سمجھنے میں بھرپور مدد ملی۔علی احمد فاطمی ۱۹/جولائی ۲۰۰۷ء کو دہلی سے روس کے لیے روانہ ہوئے۔دہلی سے ماسکو ساڑھے پانچ گھنٹے کا سفر اور ماسکو میں ڈیڑھ گھنٹے قیام کے بعد دوسرے جہاز پر سوار ہو کر پھر ڈھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد جہاز برلن پہنچا۔برلن ایئرپورٹ پر عارف نقوی سے ملاقات کے بعد عارف نقوی کے گھر جاتے ہوئے راستے میں تاریخ کے پنوں کو پلٹتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> ''ہائے یہ وہی جرمنی ہے جس نے کبھی دنیا میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔وہی جرمنی جہاں کبھی نازیوں کی حکمرانی یا من مانی رہی۔ایک وقت تھا جب جرمنی اور ہٹلر ہی نہیں جرمنی اور جنگ لازم وملزوم بن چکے تھے۔ایک وقت ایسا تھا جب یہ اکیلا ساری دنیا سے لڑ رہا تھا....... یہ الگ بات ہے کہ اس میں اس کی شکست ہوئی اور ایک اندازے کے مطابق اس میں ایک کروڑ سے بھی زیادہ جرمن مارے گئے....... لیکن اس میں روس،برطانیہ،فرانس،پولینڈ کے لوگ بھی تعداد میں مارے گئے..... جرمن میں نظریات کی جنگ بھی ہمیشہ ہوتی رہی۔یہاں ابتدا سے ہی دو نظریے کام کرتے رہے ہیں۔ایک طرف ترقی پسند نظریہ تو دوسری طرف رجعت پسند نظریہ۔ان نظریات کی وجہ سے جرمنی ہمیشہ سے ہی دو حصّوں میں تقسیم رہا۔'' (۶۳)

سفر نامہ نگار نے اس اقتباس میں جرمنی کے تاریخی پہلوؤں کے ساتھ اس کے سیاسی پہلو کو بھی دلکش انداز میں قلم بند کیا ہے۔یہی سفر نامہ کی بنیادی خصوصیات ہیں جن سے قاری ان کی طرف مائل ہوتا ہے۔

جرمنی کی بنائی ہوئی چیزیں دنیا بھر میں مشہور ہیں۔جرمنی صرف صنعت گری میں ہی نہیں بلکہ آرٹ،کلچر،موسیقی

اورفلسفہ کے بارے میں بھی اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے۔اسی لیے ہندوستان کے مصنفین جرمن صوفیوں اورفلسفیوں سے اثر پزیر رہے ہیں۔

علی احمد فاطمی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شہر برلن کی بہت سی چیزوں کا مشاہدہ گہرائی وگیرائی سے کیا ہے۔ چونکہ یہ سفر ایک سیمنار کے تعلق سے کیا گیا تھا۔انہوں نے خالی وقت میں شہر برلن کی سیاحت کی اور قاری کوشہر برلن کے بارے میں بہت سی معلومات بھی فراہم کی ۔علی احمد فاطمی کے سرزمینِ جرمنی پر قدم رکھتے ہی وہاں کے ماضی کی سیاسی تاریخ بالخصوص ہٹلرکی آمرانہ حکومت اور نازیوں کے تشدد کا منظر سامنے آجا تا ہے۔

علی احمد فاطمی نے اس سفر میں عارف نقوی کے چھوٹے سے فلیٹ کا منظر بیان کیا ہے اور فلیٹ میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی شام کو بذریعے کار سیر وتفریح کرنے نکلے۔چوڑی چوڑی سڑکوں پر پوری ڈسپلن کے ساتھ چلتے ہوئے ایک جگہ کار پارک کیا اوراس کے بعد وہ ٹہلنے لگے۔جرمنی کی تاریخ،ماحول اور وہاں کے لوگوں کی عکاسی بیان کرتے ہوئے علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

> ''شاندار ،پرانی عمارتیں،میوزیم،پارلیمنٹ ہاؤس ،لائبریری، چرچ .....وہ بھی الگ الگ ....ایک طرف جرمن چرچ دوسری طرف فرنچ چرچ ...... اوپیرا.......فٹ پاتھوں پرادب وآداب کے ساتھ تیزی سے گذرتے ہوئے مرد عورتیں ...... چھوٹی بڑی سائکلیں .... جرمنی میں سائکلوں کا بڑا رواج ہے۔طرح طرح کی شکلوں کی سائکلیں ،طرح طرح کے لوگوں کے ہاتھوں میں دیکھیں بوڑھے مرد اور عورتیں بھی چلاتے ہوئے۔یہاں تک کی میٹرو کے اندتک داخل ہونے والی سائکلیں ۔لیکن یہاں بھی ڈسپلن۔جن ڈبوں پرسائکل کا نشان بنا ہوتا ہے سائکلیں اسی میں جاسکتی ہیں اور ایسا ہی ہوتا ہے۔'' (٦٤)

علی احمد فاطمی جرمنی کی عورتوں اور مردوں کو ساتھ ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت واستعجاب میں پڑ جاتے ہیں۔یہ محنت کش قوم ہے اسی لیے شاید ان کی کامیابی اور کامرانی کا راز بھی یہی ہے۔جرمنی میں ایک عورت کو سائکل چلاتے ہوئے دیکھ کر ان کو ہندوستانی عورتیں یاد آنے لگتی ہیں۔علی احمد فاطمی مذکور ہیں:

> ''اور آگے ہم نے ایک سائکل ایسی بھی دیکھی جس کو عورت چلا رہی تھی جس کا ایک

بچا آگے کنڈیا میں بندھا ہوا تھا اور پیچھے دوسرا بچہ رسّی سے کسا ہوا تھا اور ان دونوں کی ماں نہایت تیزی سے سائکل چلاتے ہوئے اُڑی چلی جارہی تھی۔اپنے ملک میں دو بچوں کی ماؤں کو اس طرح سائکل چلاتے ہوئے دیکھنا تو دور تصور کرنا بھی محال ہے۔'' (۶۵)

علی احمد فاطمی آگے اس سفرنامے میں جرمنی کے مشہور شہر برلن کے خوبصورت مناظر کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''برلن شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے درمیان سے بہنے والی نہر....... گہری نیلی اور شفاف نہر، بالکل شہر کے قلب سے گذرتی ہوئی۔شہرانتظامیہ نے اِردگرد کے ماحول اس قدر خوبصورت اور جاذبِ نظر بنا دیا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔چھوٹی بڑی ناؤیں اور اسٹیمر مسلسل گھومتے اور گھماتے رہتے ہیں۔کناروں پر ہوٹلوں، دوکانوں اور سیر وتفریح کے سامانوں نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔کچھ پکنک اسپاٹ بنا دئے گئے جہاں نہر کے کنارے کرسیاں پڑی ہوتی ہیں۔اور آس پاس بچے سائکل چلاتے یا فٹ بال کھیلتے رہتے ہیں۔گوری چمڑی کے مرد اور عورتیں کرسیوں پر نیم دراز دھوپ کی سنکائی کرتے رہتے ہیں۔سنکائی کرنا با قاعدہ ایک مشغلہ ہوتا ہے۔یہ نیم درازیاں کہیں کہیں دست درازیوں کی شکلوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔'' (۶۶)

علی احمد فاطمی آگے اس سفرنامے میں کانفرنس کی تیاریوں اور پروگرام ہال اور کافی ہاؤس وغیرہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''تھوڑی دیر میں ہم لوگ اس علاقہ میں تھے جہاں یہ عمارت اور ہال ہے۔یہ جگہ کافی گنجان تھی۔ہوٹلوں سے ملی ہوئی چاروں طرف فٹ پاتھ پر کرسیاں،سگریٹ کا دھواں،جس میں عورتوں کی سگرٹوں کے میٹھے میٹھے دھوئیں بھی شامل تھے۔آزادی اور جوانی کی مہک چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔کچھ کافی ہاؤس جیسی جگہ لگی۔لیکن ہندوستان کے کافی ہاؤس سے مختلف۔کیونکہ کرسیوں کے ہر گھیرے میں جتنے مرد تھے کم وبیش اتنی ہی عورتیں۔پھر ہم کافی ہاؤس میں گرجتے زیادہ ہیں برستے کم ہیں۔اور

یہ گرجتے کم ہیں برستے زیادہ ہیں۔ہم کپڑے زیادہ پہنتے ہیں کام کم کرتے ہیں۔یہ کام زیادہ کرتے ہیں کپڑے کم پہنتے ہیں۔اور جہاں کپڑے کم ہوں گے وہاں بارش تو ہوگی۔چنانچہ ان حلقوں میں برہنگی کے آثار بھی تھے لیکن یہ برہنگی سگریٹ کے مرغولوں میں دھندلی دھندلی سی نظر آرہی تھی۔ایک عجیب سی رونق تھی بازار میں جو اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔بڑے بڑے اُڑے اُڑے سے سر کے بال،پھٹی پھٹی سی جینز،کچھ ڈائری،کچھ قلم،لگا کہ یہ اپنے قبیلے کے لوگ ہیں۔انہیں دیکھنا اچھا لگا۔بے ساختہ جی چاہنے لگا کہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک کپ چائے یا کافی پیتے ہوئے ان سے کہا جائے .... اے جرمن باسیوں....... تم کس قماش کے لوگ ہو۔کیا کھاتے،کیا پیتے ہو۔ایسا کیا کرتے ہو کہ دوبار بُری طرح تباہ ہوئے ..... پھر بھی دامن جھاڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی محنت ومشقت کے ذریعہ دنیا کے بازار میں اپنی صنعت گری اور سربلندی کا پرچم لہرادیا....... دوبار تو ہم بھی تباہ ہوئے لیکن ہم پر ابھی بھی تباہی کے اثرات قائم ہیں۔'' (۶۷)

علی احمد فاطمی نے مذکورہ بالا اقتباس میں جرمنی کے سیمنار،وہاں کے ہوٹلوں،عوام اور ان کی جفاکشی نیم برہنہ عورتوں کو ہندوستانی تہذیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔آخر میں انقلاب ۱۸۵۷ء اور آزادی ۱۹۴۷ء کے واقعہ سے ہندوستان کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتے ہوئے جرمنی کی بلند ہمتی کی تعریف کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں کسی بھی شہر کی تاریخ وجغرافیہ کو فراموش نہیں کرتے۔

علی احمد فاطمی کے اس سفرنامے میں رومانویت کے بھی اثرات غالب نظر آتے ہیں۔علی احمد فاطمی کی خوبی یہ کہ انھوں نے اپنے اس سفرنامے میں صرف سیاسی اور تاریخی بیان پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ تخیل کی آمیزش سے اس سفرنامے کو اور بھی دلچسپ بنادیا ہے۔انہوں نے اپنے داخلی جذبات واحساسات کا بیان افسانوی اسلوب میں پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''میٹرو آگئی اور ہم اس میں داخل ہوئے۔اندر ڈبّے میں طرح طرح کے لوگ بلکہ یوں کہئے کہ طرح طرح کی عورتیں اور لڑکیاں ہمارے اعتبار سے مکمل لباس تو کسی کا تھا ہی نہیں۔بے جان پرندے تو قید میں تھے اور جاندار دھڑک رہے تھے۔بلکہ

چھلک رہے تھے۔ ہمارے سینے بھی دھڑکنے لگے۔ عجب حال تھا۔ نظریں بہک رہی
تھیں لیکن ان پر قابو بھی ضروری تھا پھر ہم تو اس دیس کے مہمان تھے۔‘‘ (۶۸)

علی احمد فاطمی نے اس سفرنامے میں آگے مقصدِ سفر یعنی بہادر شاہ ظفر سیمنار کی رپورٹ تیار کی ہے اور اسے ذیلی عنوان ’’شامِ ظفر‘‘ سے شروع کیا ہے۔ یہ سفرنامہ صفحہ نمبر ۳۱ تا ۶۰ تک کانفرنس کی روداد ہے، جو تقریباً ۳۰ ؍صفحات پر پھیلا ہوا رپورتاژ ہے اور باقی کا سفرنامہ۔ اس میں کانفرنس ہال کا ماحول اور لوگوں کا ہجوم اور تقریروں کی نقل اور پورے معاشرے کے مناظر کو علی احمد فاطمی نے پیش کیا ہے۔ انھوں نے تمام شعراء کے خاص خاص اشعار کو اس سفرنامے میں نقل کیا ہے۔ علی احمد فاطمی نے اس ۳۰ ؍صفحات میں جرمنی کی تہذیب، عوامی کلچر اور ہوٹلوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’۲۱ جولائی ۲۰۰۷ء کو اسی بہادر شاہ ظفؔر سے منسوب ایک خوبصورت شام اردو انجمن برلن کی طرف سے جرمنی کی راجدھانی کے مرکز میں Heinrich-Boell-Foundation ہائنرش بوئل فاؤنڈیشن کی عمارت کے ہال میں منائی گئی۔ جس کی کامیابی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ برلن سے نکلنے والے ایک جرمن روزنامے Neues Deutschland نے اس جلسے کی خبر چار کالم میں ان سرخیوں کے ساتھ شائع کی:

Applaus fuer Indiens letzen Kaiser Berliner-Urduverein initiierte Gedenken zum 150.

(ہندوستان کے آخری شہنشاہ کو خراج۔ برلن اردو انجمن نے گنگا کی وادی میں ہوئی جنگ آزادی کی ۱۵۰ ویں سالگرہ منائی)‘‘ (۶۹)

علی احمد فاطمی کے اس سفرنامے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے تصاویر بھی پیش کی ہے، خاص طور سے شامِ ظفر کے جلسے کی تصاویر۔ علی احمد فاطمی کے اس سفر کا ایک اہم مقصد سیمنار ’’بہادر شاہ ظفؔر اور جنگ آزادی‘‘ میں شریک ہونا تھا۔ انہوں نے اس سفرنامے میں سیمنار کے متعلق لکھا ہے۔ اس سیمنار میں کتنے لوگ شریک ہوئے تھے اور ان لوگوں کو اردو زبان وادب سے کتنی محبت ہے اور دوسرے ملک کے شریک لوگ اردو زبان کو کس طرح سینے سے لگائے

ہوئے ہیں،علی احمد فاطمی نے ان تمام تفصیلات کو اپنے اس سفرنامے میں یکجا کیا ہے۔تا کہ قاری اس سفرنامے کے مطالعے سے ان تمام چیزوں سے بخوبی واقف ہو سکے۔اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اردو انجمن کی تقریب کے خاص معززِ مہمان تھے الہ آباد یونیورسٹی، ہندوستان، کے شعبہ اردو کے ممتاز پروفیسر جناب علی احمد فاطمی، جو آل انڈیا پروگریسو رائٹرس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری بھی ہیں اور خاص طور سے اس تقریب میں شرکت کے لئے یہاں آئے تھے۔ دیگر مقررین میں ہمبولڈ یونیورسٹی برلن کے جنوبی مشرقی ایشیائی شعبہ کے صابق صدر پروفیسر یورگین لُٹ اور کلکتہ سے آئے ہوئے ماہر لسانیات پروفیسر سنیل سین گپتا شامل تھے۔نیز پاکستانی، ہندوستانی، جرمن، ایرانی، بنگالی، پنجابی وغیرہ مختلف زبانوں وقومیتوں کے لوگ اور بہت سے شعراء موجود تھے جو اردو زبان و ادب کی دلکشی وچاشنی نیز ۱۸۵۷ء کے انقلاب آزادی کے بارے میں تقریروں کی کشش اور محفل مشاعرہ میں غزلوں اور نظموں کو سننے کے لئے دور دور سے آئے تھے۔'' (۷۰)

اس سفرنامے میں سیمنار کے علاوہ ایک مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔اس مشاعرے کی صدارت کی ذمہ داری علی احمد فاطمی کو دی گئی اور نظامت ظہیر انور نے کی۔انھوں نے مشاعرے سے متعلق تمام جزئیات کو بیان کیا ہے۔ اوراس مشاعرے میں شریک شعراء کی طویل فہرست درج کی ہے۔ان میں چند اہم نام جن کا ذکر علی احمد فاطمی نے کیا ہے وہ یہ ہیں: فاطمہ خورشید،شری متی اجی گوئل،عشرت معین سیما،کاؤس ابراہیمی،علی حیدر وفا،عارف نقوی ،خواجہ حنیف تمنّا،طاہرہ رباب اور دیگر شعراء نے ہندی، انگریزی، فارسی،اردو اور جرمن زبانوں میں غزلیں اور نظمیں پیش کی۔علی احمد فاطمی نے مشاعرے کی تمام تفصیلات کو نہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے۔اورانہوں نے مشاعرے کے اچھے شعراء کے کلام کا بھی ذکر کیا ہے، جسے سامعین نے بہت پسند کیا ہے۔مثال کے طور پر عارف نقوی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

صیاد نے پر نوچے قاتل نے گلا کاٹا
کھولی تھی زباں میں نے پوچھا تھا کہ دانہ ہے
اک داغ ہے سینے میں دو اشک ہیں آنکھوں میں
مفلس نہ مجھے سمجھو یہ میرا خزانہ ہے

علی احمد فاطمی اپنے اس سفرنامے میں جرمنی کے مشہور شہر برلن کی خوبصورت اور انوکھی شام کی منظر کشی بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''بلڈنگ سے باہر آئے تو برلن کی خوبصور اور انوکھی شام نظر آئی۔اسی مقام پر جہاں دن میں لوگ پھل بیچ رہے تھے۔کچھ اور دکانیں لگی ہوئی تھیں،سب غائب تھیں۔ان کی جگہ پر جا بجا کرسیوں کے گھیرے تھے اور لوگوں کی بھیڑ تھی۔لوگ مشروبات میں مصروف تھے،کچھ کھڑے،کچھ بیٹھے،کچھ محبوب کی باہوں میں باہیں ڈالے تقریباً لیٹے ہوئے تھے۔کوئی بوس و کنار میں مصروف،کوئی پینے میں اور کوئی گانے میں۔عجب نشہ اور ماحول تھا۔جی چاہا کہ اس مستی بھرے ماحول کا مزہ لیا جائے۔کچھ دیر یہاں ٹھہرا جائے۔لیکن میزبان تیزی سے نکل جانے کے موڈ میں تھے۔اُن کے لئے یہ سب عام منظر تھے،عام سی بات تھی،پھر سب کو دور دور جانا تھا۔'' (۱۷)

سفرنامہ نگار نے اس اقتباس میں برلن کی خوبصورت شام،بازاروں اور وہاں کے عوامی منظر نامے کو نہایت سلیقے سے پیش کیا ہے۔انہوں نے اس سفرنامے میں جرمنی کے سماجی مسائل پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔اس سفرنامے میں انہیں اخلاقی اقدار اور جنسی بے راہ روی سے تکلیف ہوتی ہے۔جرمنی کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کو مشرقی تہذیب کی عینک سے دیکھتے ہوئے علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

''لیکن میں ایک ایک منظر کو جذب کر لینا چاہتا تھا۔ٹھہرنا چاہتا تھا۔تاکہ رات کی برلن کو دیکھوں۔مغرب کی اصل تصویر دیکھوں۔لیکن کس طرح رکتا۔کیسے رکتا۔پھر بھی گزرتے ہوئے لمحوں نے جو کچھ مجھے دکھایا وہ کم از کم میرے لئے چونکا دینے والا تھا۔گوری گوری لڑکیاں کالا کالا مختصر بلکہ مختصر ترین لباس بالکل نیم برہنہ بلکہ یوں کہیئے کہ مکمل برہنہ ہونے کے لئے بیتاب۔سینوں کا کھلا رہنا عام سی بات تھی۔جینس کی پھٹی کٹی نیکریں وہ بھی اس قدر مختصر کہ جانگوں سے چمٹی ہوئی کہ بس پوچھیئے مت۔زیادہ تر نشہ میں دھت سگریٹ پیتی ہوئیں لیکن کچھ حلقوں میں یہی لڑکیاں یا عورتیں بڑی سنجیدگی سے باتیں کرتی ہوئی۔اگر اس فحاشی کو دور کر دیا جائے اور بات

صرف رونق اور گہما گہمی کی کی جائے تو واقعی یہ جگہ بڑی شاندار اور جاندار لگی۔''
(۷۲)

علی احمد فاطمی آگے اپنے اس سفرنامے میں برلن شہر کے ریلوے اسٹیشن اور اس کے باہر کے خوبصورت مناظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''جگمگاتا ہوا ریلوے اسٹیشن۔کئی منزلوں والا اور ہر منزل پر بازار کی سی کیفیت کیونکہ ہر منزل پر دوکانیں اور ریستوراں تھے اور بھیڑ تھی....... باہر آئے تو یہاں کا ماحول کچھ دوسرا ہی تھا سامنے اسپرنگ دریا بہہ رہا تھا....... اس کے اردگرد کا ماحول بیحد خوبصورت تھا۔ یہاں بھی دوکانیں، ریستوراں۔ پرانے طرز کی کرسیاں، آرام کرتے لوگ اور دریا میں رواں دواں اسٹیمر، اور اسٹیمر میں بھرے بچے، بڑے بوڑھے تفریح کے موڈ میں ہاتھ ہلاتے ہوئے۔عجب سماں تھا۔'' (۷۳)

علی احمد فاطمی نئے برلن کو دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ نئے پن کی علامت نئی عمارتیں تو ہوتی ہی ہیں، نئی نئی لڑکیوں کے ادھ کھلے جسم بھی ہوتے ہیں اور طرح طرح کے بے حجاب مناظر بھی۔ یہ سب کچھ وہاں نظر آرہا تھا۔ کچھ بھی ہو یہ جگہ بڑی پُر فضا تھی کھلی کھلی ہوا کے کھنک اور نرم جھونکوں سے بھری ہوئی تر و تازہ جو نئے برلن کے نئے پن میں خوشگوار اضافہ کر رہی تھی۔ اس سفرنامے میں جدید ٹکنالوجی کو بیان کرتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''اب ہم ایک نئے راستے سے ہو کر جارہے تھے جہاں درمیان میں ایک ٹنل (Tunnel) پڑتی تھی۔ دور تک پھیلی ہوئی روشن ٹنل....... جس کے بارے میں علم ہوا کہ یہ ٹنل دریا کے نیچے سے نکالی گئی۔ دریا کے اوپر سڑک اور سڑک کے اوپر سے ٹرین گزرتی ہے۔ یہ سارے مناظر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور انسانی ذہن کی حیرتناک کرشما سازی بھی..... یہی نہیں جرمنی میں اسٹیل کے کاموں..... اسٹیل کی عمارتوں کا بڑا عمل دخل ہے..... میں نے اپنی آنکھوں سے یہ حیرت انگیز چیزیں بھی دیکھیں۔'' (۷۴)

انھوں نے اس اقتباس میں ٹنل کی خوبصورتی کو بیحد دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم جو بھی دیکھ سکتے تھے دیکھتے رہے۔ علی احمد فاطمی ٹنل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ برلن کی جان بھی، برلن کی شان بھی اور ٹنل کی کان بھی

لمبی اور جگمگاتی ہوئی ٹنل سب کچھ دیکھا۔ برلن شہر تاریخ وتہذیب کے اعتبار سے اپنی غیر معمولی انفرادیت رکھتا ہے۔

علی احمد فاطمی آگے عارف نقوی کے ساتھ پرگامان میوزیم دیکھنے گئے۔انہوں نے پرگامان میوزیم دیکھا اور معلومات فراہم کی۔انہوں نے اس سفرنامے میں پرگامان میوزیم (PERGAMON MUSEUM) کی تعریف نہایت پرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔اس سفرنامے میں میوزیم پرگامان کے باہر کا منظر، درمیان میں بہتی ہوئی نہر تصویر میں پیش کیا گیا ہے۔ پرگامان میوزیم کی تاریخ بیان کرتے ہوئے علی احمد فاطمی رقم طراز ہیں:

''پرگامان میوزیم (PERGAMON MUSEUM)۔نام عجیب سا لگا۔ پتہ چلا کہ پرگامان ان علاقوں کے ناموں کا مخفف ہے جہاں سے قدیم چیزیں حاصل کی گئی ہیں۔ان میں، یونان، روم، شام، مصر، بابل وغیرہ زیادہ تھے۔ بہت بڑا لحیم شحیم ۔بڑے بڑے دالان بلکہ ہالوں میں مختلف بادشاہوں ،وزیروں، سپاہیوں، مردوں، عورتو ں ، جانوروں کے مجسّمے۔کچھ پورے کچھ ادھورے، کچھ ٹوٹے..... لیکن ان سب کو بڑے سلیقے سے بنا سجا کر رکھا گیا ہے۔''

(۷۵)

اس سفرنامہ کو اگر فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بیانیہ انداز کم پایا جاتا ہے۔اس سفرنامے میں جرمنی کے سیاسی تاریخی اور وہاں کے کلچر پر کثرت سے گفتگو کی گئی ہے۔اس سفرنامے کے اسلوب میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے، جو نہایت پرلطف اور سلیس ہے۔علی احمد فاطمی نے اس سفرنامے میں روزمرّہ بولی جانے والی زبان کو بھی استعمال کیا ہے۔انہوں نے اس سفرنامے میں کہیں کہیں طنز اور مزاح سے بھی کام لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ علامات و استعارات کا بھی استعمال کیا ہے۔علی احمد فاطمی جرمنی کی تہذیب ومعاشرت پر گہری نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اچانک نظر پڑی کہ فٹ پاتھ پر ایک عورت ایک ساتھ چار کتوں کو لئے جا رہی تھی۔چاروں کی لگام اس کی نرم ونازک انگلیوں میں تھی۔وہ خود بھی جتنی نرم ونازک تھی کتے اتنے ہی غضبناک اور خطرناک۔میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ہائے ہمارے یہاں ایک مرد اور چار بلّیاں اور یہاں ایک عورت اور چار کتّے۔خدا کی پناہ۔'' (۷۶)

علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں جرمنی کے سیاسی وتاریخی حالات کا بیان کثرت سے کیا ہے کیونکہ

جرمنی ایک ایسا ملک ہے، جس نے دو عالمی جنگیں اکیلے ہی لڑیں اور ملک تباہ و برباد ہو گیا۔ ان تمام نقصانات کے باوجود جرمنی کی الگ شناخت ہے۔ جرمنی دو ٹکڑوں مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی میں تقسیم ہو گیا لیکن آج دونوں پھر سے مل گئے ہیں۔ علی احمد فاطمی کو جرمنی کے اتحاد کے حوالے سے گفتگو کے دوران اپنا ملک یاد آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے لوگ پھر سے ایک ہو جائیں؟ کیا مسلۂ کشمیر کا حل ممکن ہو سکتا ہے؟ علی احمد فاطمی ان تمام سوالات میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''عارف صاحب بولے۔''تم لوگ ہند و پاک کے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہو اچھی بات ہے۔''
>
> میں نے عرض کیا۔عوام کی طرف سے کوششیں ہیں۔ادیب و شاعر سبھی چاہتے ہیں۔ہم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ جب برلن کی دیوار گر سکتی ہے دونوں جرمنی ایک ہو سکتے ہیں تو ہند و پاک کیوں نہیں ایک ہو سکتے۔''
>
> ''دیکھو فاطمی۔اس میں اور اس میں فرق ہے۔برلن کی تقسیم حکومت کی سطح پر ہوئی تھی عوام کی سطح پر نہیں اس لئے جیسے ہی حالات بدلے حکومت کا مزاج بدلا دونوں برلن ایک ہو گئے لیکن ہند و پاک کی صورت حال مختلف ہے وہاں تو بہت کچھ عوام کی سطح پر ہوا ہند و مسلم کی سطح پر ہوا۔اب یہ دونوں مکمل منفرد اور آزاد مملکتیں ہیں اب ان دونوں کو ملانے کے لئے دیوار برلن کی مثال دینا مناسب نہیں۔اس کا غلط پیغام جا سکتا ہے۔حیرت ہے کہ ہند کے وزیر اعظم نے بھی پچھلے دنوں ایک تقریر میں یہی بات کہی جب کہ سیاسی بیانات سوچ سمجھ کر دینا چاہئے۔'' (۷۷)

علی احمد فاطمی آگے مذکور ہیں کہ جرمنی میں ٹریفک اور موسم کی خبر سنے بغیر کوئی بھی گھر سے باہر نہیں نکلتا۔اس سفر نامے میں انہوں نے شہر ٹیٹلان (TETLON) کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی جرمن قوم کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ قوم بے حد محنتی۔سچی اور مہذب قوم ہے۔کچھ دنوں قبل تک انہیں یہ تک نہیں معلوم تھا کہ جھوٹ کیا چیز ہوتی ہے۔اس قدر ڈسپلن وے میں کام کرتی ہے کہ آپ مجبور ہو جائیں گے اسی طرز پر کام کرنے کے لئے۔ایک دوسرے کی عزّت بھی بہت

کرتے ہیں۔ میں جس دفتر میں ہوں یہ لوگ بہت عزت دیتے ہیں میں تو قائل ہو گیا ہوں جرمنوں کا۔ صاحب قومیں ایسے ہی ترقی نہیں کرتی ہیں۔ خون پسینا بہانا پڑتا ہے۔'' (۷۸)

علی احمد فاطمی نے آگے اس سفرنامے میں برلن کے تاریخی شہر پوسڈم کا ذکر کیا ہے۔ پوسڈم چھوٹا شہر ہونے کے باوجود ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ پوسڈم شہر اپنے معاہدوں کے لیے بھی شہرت کا حامل ہے۔ پوسڈم شہر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عارف نقوی نے ''جرمنی کل اور آج'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

''پوسڈم میں جس معاہدے پر دستخط کئے گئے اس کی روح جرمن کمیونسٹ پارٹی کے اعلانیہ ۱۱ جون ۴۵ء اور فاشزم مخالف پارٹیوں کے بلاک کے قیام پر برلن میں ۱۴ جولائی ۴۵ء کے اعلانیہ میں مل جاتی ہے۔ یہ بلاک جرمن کمیونسٹ پارٹی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی جرمنی۔ کرسچین ڈیموکریٹک یونین اور لبرل ڈیموکریٹک پارٹی پر مشتمل ہے۔'' (۷۹)

علی احمد فاطمی نے عارف نقوی کے اس اقتباس کو جوں کا توں اپنے اس سفرنامے میں نقش کر دیا ہے۔ پوسڈم شہر محلوں، فوجی عمارتوں، پارکوں، سنیما گھروں اور فلم اسٹوڈیو کے لیے بھی شہرت رکھتا ہے۔ اسی شہر میں ایک عمارت سانسوی (SANS-SOUCI) ہے، جو ایک بڑا پارک ہے، جس کے وسط میں ایک محل بھی ہے۔ لیکن اب اس محل کو میوزیم اور بڑے علاقے کو پارک میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ سانسوی کو کچھ لوگ آرام محل بھی کہتے ہیں۔ علی احمد فاطمی پوسڈم پارک اور میوزیم کی تعریف بیان کرتے ہوئے مذکور ہیں:

''اب تو یہ خوبصورت پکنک اسپاٹ ہے واقعی اس کی عمارت۔ در و دیوار۔ ستون۔ پھاٹک سب کچھ نہایت شاندار اور قدیم طرز کے تھے۔ ستون پر شیر کا چہرہ۔ یا سپاہی کا غصہ ور چہرہ یا اسی نوعیت کے بوسیدہ مجسمے بنے ہوئے تھے جو بہت پرانے لگ رہے تھے۔ ہم سیڑھیوں سے چڑھتے ہوئے نہایت وسیع وعریض احاطہ میں داخل ہوئے۔ سامنے نیچے جانے کے لئے چوڑی چوڑی پھیلی ہوئی سیڑھیاں۔ گولائی میں خوبصورت باغیچہ اور باغیچہ کے بیچ پانی کا چھوٹا سا صاف ستھرا تالاب اور تالاب کے بالکل بیچ سے پھوٹتا ہوا تیز رفتار فوارہ۔ بڑا دلکش منظر تھا۔ اوپر سے کچھ زیادہ ہی دلکش

نظر آ رہا تھا۔'' (۸۰)

انہوں نے پوسڈم پارک کے خوبصورت مناظر کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی آگے پوسڈم پارک میں بارش کے خوبصورت مناظر کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''موسم بیحد سہانا ہو گیا تھا یا اس پر فضا مقام پر کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔بیحد کھلی کھلی فضا۔خنک ہوا۔بارش کی نمنا کی نے اس میں نشا سا گھول دیا تھا۔جھومتے ہوئے پیڑ۔ان کی اوٹ میں دور بادلوں کا ہجوم روئی کے گالے۔جیسے بلی کے چھوٹے چھوٹے سفید بچے اٹھکھیلیاں کر رہے ہوں۔بے تحاشہ جی چاہ رہا تھا کہ پرندہ بن کر بادلوں کے بیچ جا کر ان کی سپیدی اور سیاحی کو روح میں اتار لیں۔عارف صاحب۔انور ظہیر۔سیما اور پیاری پیاری سارا مایا بالکل فرشتے سے لگے۔جیسے ابھی ابھی آسمان سے اترے ہوں۔'' (۸۱)

سفر نامہ نگار نے اس پارک کے فوّارے اور تالاب اور ساتھ ہی تالاب میں تیرتی ہوئے بطخوں،کووں اور مچھلیوں کا ذکر پر لطف انداز میں کیا ہے۔پوسڈم پارک کے بعد آگے علی احمد فاطمی نے ٹی۔وی۔ٹاور کی سیر کا ذکر کیا ہے۔اس سفر نامے میں انہوں نے ٹی وی ٹاور کے پاس کے ایک فوّارے اور درمیان میں سمندر کے دیوتا کے مجسمے کو خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔علی احمد فاطمی ٹی وی ٹاور کے پاس کے مناظر کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ٹی وی ٹاور کے سامنے خاصی بھیڑ تھی۔لوگ مجسموں اور فواروں کے درمیان ٹہل گھوم رہے تھے۔ہم بھی اس میں شامل ہوئے۔پتھر کے بڑے بڑے ڈراونی ہیئت کے مجسّمے جن میں طرح طرح کے خوف ناک چہرے بنے ہوئے تھے جن کے منھ سے پانی نکل رہا تھا کچھ ایسے ننگے ننگے سے مجسمے تھے جس سے جمال تو کم مکروہ قسم کا جلال ضرور پھوٹ رہا تھا۔'' (۸۲)

اس سفر نامے میں برلن میں رہنے والے ہندوستانیوں کا بھی ذکر دیکھنے کو ملتا ہے،جو طویل عرصے سے برلن میں مقیم ہیں اور ساتھ ہی اپنی مشرقی تہذیب کو بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں۔علی احمد فاطمی نے اس سفر نامے کے اختتام کے چند صفحات میں جرمنی کی ایک خوبصورت لڑکی انا کا ذکر جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی انا کے اخلاق،عادات واطوار اور انداز وگفتگو سے متاثر ہوئے۔چونکہ انا ٹوٹی پھوٹی ہندی سے واقف تھی۔اسی لیے علی احمد فاطمی کو گفتگو کرنے

میں کوئی پریشانی درپیش نہیں آئی۔اس ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''انا سے اور بھی باتیں ہوئیں۔ پوری بے تکلفی کے ساتھ جیسے ہم ایک دوسرے کو مدّت سے جانتے ہوں۔آپ کسی جرمن سے ملئے اس طرح مسکرا کر ملے گا جیسے پرانی جان پہچان ہے....... نہایت خوش اخلاقی اور تمیز سے پیش آئے گا۔انا اسی تہذیب کی پروردہ ہے..... جس پر صدیوں کی روایت کام کر رہی ہے۔'' (۸۳)

علی احمد فاطمی کا یہ سفر مختصر مدت کے لیے ہی تھا۔اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی جرمنی کے اچھے مقامات کی سیر نہیں کر سکے۔انہیں ہائیڈل برگ کی سیاحت کرنے کا شوق تھا لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔جرمنی میں ہائیڈل برگ ایک ایسی یونیورسٹی ہے، جہاں سے شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ہائیڈل برگ شہر سے اقبال کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور ان کے نام سے ایک سڑک بھی ہے۔علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفرنامے میں علامہ اقبال کا ذکر جذباتی انداز میں کیا ہے۔اور جب انہیں جرمنی کی ایک لڑکی انا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہن ہائیڈل برگ میں رہتی ہے،اور وہاں یونیورسٹی میں پڑھتی ہے، یہ سب سن کر وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔علی احمد فاطمی کے ہائیڈل برگ کی سیاحت کی اشتیاق کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''میں لیٹے لیٹے سوچتا رہا کہ مِس ایما اور پروفیسر ہول سے تو خیر کیا ملاقات ہوگی کہ انھیں اس دنیا سے رخصت ہوئے بھی عرصہ ہو گیا لیکن کیا ہائیڈل برگ اور میونخ شہر اور یونیورسٹی کی زیارت ہو سکے گی۔اس خیال میں گم مجھے کب نیند آ گئی کچھ پتہ نہ چلا۔'' (۸۴)

علی احمد فاطمی نے آگے اس سفرنامے میں ایک اور پارک GARDEN DERKIELT کا بھی ذکر کیا ہے۔یہ عارف نقوی کی بیگم انگرڈ کا پسندیدہ پارک تھا۔اس پارک کا ایک ایک خوبصورت گوشہ علی احمد فاطمی نے تصویروں کے ساتھ پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی اس پارک کے خوبصورت مناظر کو پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آگے کے مناظر جنّت کی طرح تھے..... ٹکڑوں میں بکھرے بکھرے سے صاف ستھرے تالاب۔ان پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے پل کہیں لکڑی، کہیں لوہے اور کہیں پتھر کے۔آس پاس جھرنے ..... طرح طرح کے پھولوں کے

پودے..... تالاب کے کنارے سلیقے سے رکھی ہوئی کرسیاں.....ایک بڑے
تالاب کے بیچوں بیچ تیرتی ہوئی خوبصورت اور سجی ہوئی ناؤ..... پتھروں کے ٹکڑوں کے
اونچے اونچے ٹیلے ان کے درمیان سے پھوٹتا ہوا پانی..... چھوٹے چھوٹے صراحی نما
گھڑوں سے اُبلتا ہوا پانی..... رنگینی اور خوشبوؤں سے بسا ہوا ماحول.....انھیں کے
درمیان خوبصورت لڑکے لڑکیاں اپنے جذبات کو قابو نہ رکھ پانے والے
جوڑے..... پل کے نیچے، آس پاس، پودوں کے جھنڈ اور سایے میں کچھ مصوّر
کینوس، برش اور رنگ وغیرہ لئے ہوئے تصویریں بنا رہے تھے۔" (۸۵)

سفر نامہ نگار نے آگے اس سفر نامے میں برلن یونیورسٹی یعنی ہوم بولڈ یونیورسٹی (HOMBOLD UNIVERSITY) کا ذکر نہایت دلکش انداز میں کیا ہے۔ ہومبولڈ یونیورسٹی میں ذاکر حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ علی احمد فاطمی نے ہوم بولڈ یونیورسٹی کو بغور دیکھا اور وہاں کے ایک ایک مناظر کو خوبصورتی کے ساتھ اپنے اس سفر نامے میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی کی عارف نقوی، انگرڈ، انور ظہیر، سیما اور راکیش رنجن وغیرہ سے ملاقات کے بعد برلن شہر سے رخصتی کی تیاریاں ہونے لگی اور پھر انہوں نے وہاں پر لوگوں سے ملنا جلنا، دعوت اور کھانوں کا بیان اور برلن ایئر پورٹ کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح یہ سفر نامہ اختتام کو پہنچا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ علی احمد فاطمی نے جرمنی کے سماجی، سیاسی، تاریخی، تہذیبی، معاشرتی، علمی اور ادبی حالات کا مشاہدہ بغور کیا ہے۔ انہوں نے جرمنی میں لوگوں کی زندگی کے ساتھ ساتھ وہاں کی جغرافیائی تاریخ، تہذیب وتمدن، تعلیمی نظام، ترقی کے اسباب، اقتصادیات اور سماج وغیرہ کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس سفر نامہ کو بیان کرنے میں انہوں نے زبان وبیان میں سادگی کا مظاہرہ پیش کیا ہے۔ اس سفر نامے کا نثر سلیس ہے، جسے قاری بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ علی احمد فاطمی کا یہ سفر نامہ عمدہ اور دلکش ہے، کیونکہ اس میں سفر نامے کی تمام جزئیات شامل ہیں۔ جرمنی کے تعلق سے لکھے گئے اب تک کے اردو سفر ناموں میں علی احمد فاطمی کے اس سفر نامے کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔

ماریشس میں چند روز

''ماریشس میں چند روز'' علی احمد فاطمی کا پانچواں سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ پہلی بار ''ماریشس میں چند روز'' کے عنوان سے ماہ نامہ ''سب رس'' حیدر آباد میں فروری تا جون ۲۰۱۶ء میں پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کا یہ سفر نامہ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے بھی اپنی تصنیف ''اردو کا عالمی تناظر'' میں ''ماریشس میں اردو'' کے عنوان سے ۲۰۱۷ء میں شائع کیا ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۵۱ صفحات پر محیط ہے۔ اس سفر نامے میں بھی رپورتاژ کا عنصر شامل ہے۔ یہ سفر نامہ رپورتاژ سے زیادہ سفر نامے کا لطف رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سفر نامے میں عالمی اردو کانفرس کے تین دن کی پوری رپورٹ ہے، جو رپورتاژ ہے اور باقی کا تین دن سفر نامہ۔ علی احمد فاطمی نے یہ سفر خواجہ محمد اکرام الدین کی دعوت پر عالمی اردو کانفرنس کے سلسلے میں صدر اردو اسپیکنگ یونین، ماریشس شہزاد عبداللہ احمد کے زیر اہتمام کیا تھا۔ یہ کانفرنس ماریشس میں ۲۶ تا ۲۸ نومبر ۲۰۱۵ء کو منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے اردو اور ہندی ادیبوں و شاعروں کا ایک وَفد اور ساتھ میں قوالوں کا ایک گروہ ۲۴ نومبر ۲۰۱۵ء کو روانہ ہوا اور چھ روز تک ماریشس میں قیام کیا۔ علی احمد فاطمی نے اس چھ روزہ سفر میں تین دنوں کی کانفرنس کے روداد کو اپنے اس سفر نامے میں رقم کیا ہے۔

علی احمد فاطمی سفر نامے کے ابتداء میں ہی اپنے سفر کی دعوت اور وجوہات کو پیش کرتے ہوئے ماریشس کی تعریف بیان کرتے ہیں۔ اور وہ یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ اس خوبصورت خطے میں اردو زبان کس طرح پھل پھول رہی ہے۔ اور پھر سفر کی تیاری وغیرہ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہیں۔ علی احمد فاطمی ۲۳ نومبر کو الہ آباد سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچنے کے بعد وہ خواجہ محمد اکرام الدین کے گھر تشریف لے گئے جہاں بیگم خواجہ اکرام نجمہ اور بیٹی سارا وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ علی احمد فاطمی کا یہ قافلہ ۲۳ نومبر کو ہی شام ۷ بجے دہلی ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوا اور پھر دہلی سے ممبئی جانے والے طیارہ نے پرواز بھری، جس نے تقریباً دو گھنٹے میں ممبئی کا سفر طے کیا۔ یہ قافلہ رات ۱۲ بجے سے لے

کر۳؍ بجے تک ممبئی ایئرپورٹ پر رہا۔ اور۲۴؍مئی کی صبح ۷؍بجے ایئر ماریشس کا طیارہ ممبئی سے ماریشس کے لیے روانہ ہوا۔علی احمد فاطمی سفر کے دوران جہاز میں ہی عنایت حسین عیدن کی کتاب ’’Urdu Studies in Maritius‘‘ پڑھتے رہے۔علی احمد فاطمی کا یہ خاص وصف ہے کہ جب بھی وہ کسی ملک کا سفر کرتے ہیں تو اس ملک سے متعلق جو بھی کتاب ہوتی ہے اس کا بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ چونکہ اسی سے ان کے مشاہدے میں اضافہ ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سفرنامہ تحریر کرنے میں دلچسپی بھی پیدا ہوتی ہے۔کیونکہ سفرنامہ نگار جتنا زیادہ اپنی معلومات کے مطابق لکھے گا واقعات میں حقیقی عنصر غالب نظر آئے گا اور ساتھ ہی قاری بھی اس سے محظوظ ہوتا رہے گا۔

علی احمد فاطمی اس سفرنامے کے ابتداء میں ہی ماریشس کی تاریخی وجغرافیائی احوال کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ’’کس طرح یہ جزیرہ آباد ہوا۔کس طرح انگریز اور فرانسیسی ،فرانسیسی اور ہندوستانی مزدوروں کو لالچ دے کر یہاں لائے اور ان سے جانوروں کی طرح سے کام لیا۔خوف کے سائے میں کھیتی باڑی کا کام کیا اور اس جزیرہ کو آباد کیا۔محض ساڑھے سات سو اسکوائر میل میں پھیلا ہوا یہ ملک بے حد چھوٹا سا ہے بلکہ ملک کیا ہے ایک جزیرہ جو چاروں طرف سمندر سے گھرا ہوا ہے جس کی آبادی ابھی بھی بارہ تیرہ لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔‘‘ (۸۶)

سفرنامہ نگار نے یہاں ماریشس کے تاریخی وجغرافیائی احوال کونہایت چابکدستی سے بیان کیا ہے۔اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ ماریشس کو بنانے میں ہندوستانی لوگوں نے کس طرح اپنا خون اور پسینا بہایا اور انسانی طاقت وذہانت کے ذریعے ماریشس جیسے جزیرے کو آباد کیا ہے۔اس اقتباس میں جہاں علی احمد فاطمی کی حساس طبیعت اور گہری سوچ نظر آتی ہے وہیں ان کی ادبی مزاج پر گہری روشنی پڑتی ہے۔

علی احمد فاطمی آگے اپنے سفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ طیارہ تقریباً ۱۲؍بجے دن کے آس پاس ماریشس کے سرزمین پر اترا۔اور یہ قافلہ ضروری کاروائیوں سے فراغت کے بعد محض Arrival Visa کے ذریعے ماریشس میں داخل ہوا۔ماریشس ایئرپورٹ کے باہر عالمی اردو کانفرنس کے انتظامیہ نے اس قافلے کا استقبال کیا۔اور نوجوان اردو اساتذہ فیاض، جمیلہ اور شب نیز وغیرہ نے اپنا تعارف کرایا۔ان کے ہاتھوں میں مہمانوں کی فہرست تھی اور چہرے پر

پُر تپاک خیر مقدمی اثرات، یہ سب کے سب اردو بول رہے تھے۔ان میں سے فیاض عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد سے اردو میں ایم اے اور شب نیز نے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے۔ان سب کا ذکر سفر نامہ نگار نے اپنے سفر نامے میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی دورانِ سفر پیش آنے والے چھوٹے اور بڑے واقعات کو اپنے سفر نامے میں رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی بھی طیران گاہ پر اترتے ہیں تو واضح کر دیتے ہیں کہ استقبال کے لیے کون کون حاضر تھے۔اگر کوئی استقبال کے لیے نہ آئے ہوں تو بھی رقم کر دیتے ہیں کہ کوئی استقبال کے لیے نہیں تھا۔اس طرح علی احمد فاطمی دورانِ سفر ہر اس شخص کا ذکر ضرور کرتے ہیں جس سے کسی طرح کا فائدہ یا سہولت پہنچی ہو۔

سفر نامہ نگار نے ماریشس کے خوبصورت راستوں سے گزرتی ہوئی بسوں، چاروں طرف پہاڑ، ہری بھری وادیاں اور وہاں کے خوشگوار موسم کا ذکر نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ ماریشس بھی ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے لیکن وہاں کی عوام ہندوستانی نہ ہوکر مغربی طور طریقہ پر زندگی گزارتی ہے۔علی احمد فاطمی ایئر پورٹ سے بس پر سوار ہوکر عالمی اردو کانفرنس جاتے ہوئے راستے کا خوبصورت فطری مناظر اور ماریشس کی خوبصورتی کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صاف ستھرا دمکتا ہوا راستہ پھولوں کی خوشبو سے معطر اور ہندوستانی تعمیر کے انداز میں چھوٹے چھوٹے جھونپڑی نما گھر جو دور سے گڑیا گڈے کے گھر لگ رہے تھے۔ایک عجیب فضا چہکتی ہوئی شب نیز اور دمکتی ہوئی ماریشس کی دوپہر اور فیاض کا سانولا چہرہ دھوپ میں سائے کی مانند ابھر جاتا ہے۔'' (۸۷)

علی احمد فاطمی مناظرِ قدرت کے دلدادہ ہیں۔کسی بھی اہم شہر یا ملک میں پہنچتے ہیں تو مناظر قدرت کا احساس کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں اور پھر اس کو اپنے سفر نامے کا حصہ بنا لیتے ہیں۔علی احمد فاطمی سفر کے بعد شہر میں داخل ہوئے اور وہاں شہر کے وسط میں واقع ایک شاندار ہوٹل گولڈ کرسٹ (Gold Crest) میں قیام کیا۔سفر نامہ نگار نے اس سفر نامے میں ماریشس کی بسوں اور وہاں کی ادب و تہذیب اور مہمان نوازی کا ذکر نہایت پر لطف انداز میں بیان کیا ہے۔

اگلے سطور میں علی احمد فاطمی نے شام کو اردو اسپیکنگ یونین دفتر جانے کا تذکرہ کیا ہے اور ہوٹل کے دروازے

پر اردو کے ممتاز ادیب و شاعر تحسین فراقی اور بیٹی حمیرا اور ان کے ساتھ میں صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر ذوالقرنین سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی ماریشس کی شام اور وہاں کے بازاروں کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''صاف ستھری بھیگی بھیگی پرسکون سڑک پیدل چلنا بہت اچھا لگا۔کچھ عجیب سا بھی لگا۔کوئی شور نہیں کوئی بھیڑ نہیں۔ پتہ چلا کہ سناٹے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں سرِ شام ہی بازار بند ہو جاتے ہیں۔یوں بھی آبادی کم ہونے کی وجہ سے بھی آسانی اور ویرانی رہتی ہے۔ہم ہندوستانی اور پاکستانی بھی بھیڑ اور شور کے اس قدر عادی ہیں کہ پرسکون اور ویران سڑک ہمیں بیوہ کی مانگ کی طرح لگی جس میں کوئی چمک نہیں ہوتی۔دھکا مکی،شور وغل،قہر آلود نگاہیں اور کبھی کبھی گالی گلوج ہماری سڑک کا ہی نہیں ہماری معاشرت کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔بلا وجہ کی اڈے بازی نظارہ ہماری سرشت میں شامل ہو چکا ہے۔ہماری فطرت بن چکی ہے اور اب ہماری ضرورت بھی۔نچلا اور متوسط طبقہ کے اکثر گھر ایسے ہیں جن کے سارے افراد بہ یک وقت ایک ساتھ گھر میں سما نہیں سکتے۔اس لئے باہر رہنا اور محلے کے چائے خانوں کو آباد کرنا ہمارا قومی و ملی شعار بن چکا ہے۔'' (۸۸)

سفر نامہ نگار نے ماریشس کی شام اور صاف ستھری پرسکون سڑک اور وہاں کے بازاروں کا ذکر نہایت چابکدستی سے کیا ہے۔اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا احاطہ کیا ہے۔نیز انہوں نے سفر نامے میں اپنی شخصیت کو موجود رکھا ہے۔اور آگے انہوں نے ماریشس کے گھروں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو اسپیکنگ یونین دفتر پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔علی احمد فاطمی اردو اسپیکنگ یونین دفتر کی تعریف بیان کرتے ہوئے مذکور ہیں:

''پرانے طرز کا بنگلہ بالکل اردو کی طرح چاروں طرف پھول پودے،گھماؤ دار راستے جس کی مشرقیت دیکھ کر مسرت ہوئی اور حیرت بھی کہ ابھی ابھی ہم سڑک پر پسری ہوئی مغربیت دیکھ کر آئے تھے۔انور پاشا نے اچھی بات کہی کہ یہ ملک مدتوں انگریز کی کالونی رہا ہے اس لئے خارجی طور پر مغرب سے متاثر ہے لیکن ہندوستانیوں کی کثرت کی وجہ سے اندر کی مشرقیت ابھی گئی نہیں ہے۔'' (۸۹)

سفر نامہ نگار نے آگے اردو اسپیکنگ یونین دفتر میں صابر گوڈر، فاروق بوچا، اشوک کمار، ندیم مصطفیٰ، شہزاد احمد اور اردو یونین کے صدر عبداللہ وغیرہ سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ان لوگوں نے کھڑے ہوکر سب کا استقبال کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ یہ ماریشس کی تیسری عالمی کانفرنس ہے، جسے ہندوستانی حکومت کا تعاون حاصل ہے۔علی احمد فاطمی نے آگے اسی دفتر میں ایک لڑکی آیناز کا ذکر کیا ہے، جس نے دہلی یونیورسٹی سے بی اے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم اے کیا ہے اور وہ اس وقت ماریشس میں (M.S.I) مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔اور پھر انھوں نے اگلے سطر میں عمدہ کھانے، عمدہ محفل اور عمدہ لوگوں سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ہوٹل کی چوتھی منزل پر قوالی کا پروگرام اور نظامی برادرس کے جوہر کا بھی تذکرہ نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

علی احمد فاطمی نے اس سفر نامے میں ماریشس کے مختصر سفر کے دوران وہاں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تاریخی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ماریشس کے تعلیمی معیار کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں کی حکومت اپنی آمدنی کا 40 رفی صد تعلیم پر خرچ کرتی ہے اور یہاں پر اردو ہندی تعلیم کا رواج بھی خوب ہے وہ اس لیے کہ یہاں ہندوستانیوں کی تعداد بہت ہے۔یہاں پر اندرا گاندھی کلچرل سینٹر ہندوستانی حکومت کا تعمیر کردہ ثقافتی ادارہ ہے، جہاں ہندوستانی فنون لطیفہ کو فروغ دیا جاتا ہے۔

سفر نامہ نگار نے اس سفر نامے میں صفحہ نمبر ۲۱۵ تا ۲۴۰ تک عالمی اردو کانفرنس ماریشس کے تین دنوں کے پروگرام کی روداد کو رپورتاژ کی شکل میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی اپنے قافلے کے ساتھ اندرا گاندھی کلچرل سینٹر گئے جہاں کے شاندار ہال میں اس عالمی کانفرنس کا افتتاح ہونا تھا، انھوں نے ساتھ ہی کلچرل سینٹر کے ڈائریکٹر سنجے شرما سے بھی ملاقات کی۔وہاں پر چسپا پوسٹرز اور بینرز کو بھی دیکھا، جس میں کہیں ناٹیہ کتھا کا ذکر تو کہیں اسلامی کیلی گرافی اور ایک کونے میں بھوجپوری اشتہار وغیرہ بھی کو دیکھا۔اس پروگرام میں اسٹیج پر خواجہ اکرام، اعجاز علی ارشد، ندیم مصطفیٰ، راؤ صاحب، انوپ مدگل اور صدر جمہوریہ ماریشس محترمہ امینہ غارب وغیرہ کا تذکرہ علی احمد فاطمی نے اپنے اس سفر نامے میں کیا ہے۔کانفرنس کے دوران ہی علی احمد فاطمی اپنے دوست واحباب کے ساتھ بس کے ذریعے سمندر کے کنارے گھومنے گئے۔وہاں ساحل کے خوبصورت قدرتی مناظر کو بیان کرتے ہوئے مذکور ہیں:

> ”لق دق سمندر، سمندر کا کنارہ، دھوپ سے اپنے بدن کو سینکتے یعنی سن باتھ (Sun Bath) کرتے مغربی اجسام اور اقسام۔عورتیں کچھ اس طرح نیم سے بھی زیادہ

برہنہ کہ بقول جوش ''بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں'' لیکن قسم لیجیے ہم
ذرا بھی نہیں شرمائے بلکہ کچھ دیر کے لئے جی چاہا کہ کاش ہم بھی ان کی طرح بے شرم
ہوتے تو بڑے ہی مزے تھے۔'' (۹۰)

مذکورہ بالا اقتباس میں سفرنامہ نگار نے ماریشس کے سمندر کی منظر کشی کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ سفرنامہ نگار نے کانفرنس کے اختتام کے بعد سنجے شرما سے ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد علی احمد فاطمی سنجے شرما اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جم خانہ کلب گھومنے گئے۔ جم خانہ کلب کے سامنے ہی ایک میدان تھا جہاں نوجوان فٹ بال کھیل رہے تھے۔ علی احمد فاطمی نے یہ بھی بتایا کہ ماریشس میں نوجوانوں کا پسندیدہ کھیل فٹ بال ہے۔ آگے علی احمد فاطمی کلب کے باہر کے فطری مناظر کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بے حد دلکش اور متاثر کن، صاف اندازہ ہوا کہ یہ گولف کا میدان ہے۔ لیکن گھاس
یوں برابر سے کٹی اور سجی ہوئی تھی جیسے کسی نے مخمل بچھا دیا ہو۔ درمیان میں تنہا کھڑے
گھنے سایہ دار درخت انسانوں کی طرح گفتگو کرتے ہوئے۔ بے حد خوبصورت منظر
جس نے آنکھوں کے ذریعے روح کو سیراب کر دیا۔'' (۹۱)

اس سفرنامے کے شروع میں ہی عالمی اردو کانفرنس کی روداد ہے، جو اپنے اندر رپورتاژ کی صفت رکھتا ہے۔ اس کانفرنس میں جو بھی مقالے پڑھے گئے ان میں سے زیادہ تر مقالے ماریشس میں اردو کی ابتدا اور ترقی سے متعلق تھے، جس سے ماریشس میں اردو کی تاریخ قلم بند ہو جاتی ہے۔ علی احمد فاطمی نے اس کانفرنس میں پڑھے گئے مقالے کی وجوہات کو بھی نقل کیا ہے، جس میں ماریشس کا ذکر اور اردو کا مستقبل شامل ہے۔ ان مقالوں کہ وجہ سے اس رپورتاژ میں سفرنامے کی جزئیات نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی سفرنامہ نگار کی اہم خصوصیات ہیں۔

سفرنامہ نگار نے آگے کھانے اور پینے کا بھی ذکر کیا ہے اور معیشت و تجارت وغیرہ کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی محنت، سادگی اور ایمانداری کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ علی احمد فاطمی ماریشس کی معاشرت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''یہاں جرائم تقریباً نہیں ہے۔ بے ایمانی نہیں ہے اور بے روزگاری بھی نہ کے برابر
ہے۔ سیاست پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہے اسی لئے کہ وہ لوگ تقریباً ٪۶۰ ہیں جن
میں مسلم تقریباً ٪۲۰ ہیں۔ بقیہ میں افریقی، انگریزی اور فرانسیسی ہیں لیکن معیشت پر
قبضہ فرانسیسیوں کا ہے مکمل جمہوری نظام ہے۔ تمام زبانوں کلچر وغیرہ کا امتزاج ہوتا

ہے اور حکومت سب کو فروغ دینے میں پوری ایماندار ہے۔ کل آبادی بارہ یا تیرہ لاکھ
سے زیادہ نہیں ہے۔'' (۹۲)

اس سفرنامے میں سفرنامہ نگار ماریشس کو ہندوستان و پاکستان کا ٹکڑا کہتا ہے تو کہیں جنت نشان لکھتا ہے۔ کل ملا کر ماریشس ایک حسین وخوبصورت ملک ہے۔ علی احمد فاطمی نے ماریشس کے خوبصورت باغات اور قدرتی مناظر کا نقشہ بہترین انداز میں کھینچا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''دور تک گنے کے لہلہاتے کھیتوں نے چمچماتی لیچی کے درختوں ہرے اور سرخ آم کے پیڑوں نے کاغذ کے درختوں نے پہاڑوں نے، وادیوں نے ان سب کے درمیان بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح سڑکوں نے آبشاروں نے، مرغ زاروں نے اور سب سے بڑھ کر یہاں کے رہنے والوں نے ماریشس کو زندہ باد۔'' (۹۳)

اس بیانیہ سے علی احمد فاطمی کی منظر نگاری کو بیان کرنے کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ علی احمد فاطمی مناظر کی تصویر کشی الفاظ کے ذریعے اس خوبصورت انداز میں کرتے ہیں کہ گویا واقعتاً ایک ماہر مصور نے تصویر اُتار کر ہمارے سامنے پیش کر دی ہو۔

اس سفرنامے کے آخر میں سفرنامہ نگار نے سیر وتفریح کا ذکر کیا ہے۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ ماریشس میں غزل گائیکی کو خوب پسند کیا جاتا ہے۔ اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ماریشس کے لوگوں کا اخلاق بہت عمدہ ہے اور یہ ملک آزادی اور روشن خیالی پر بھی یقین رکھتا ہے۔ آگے علی احمد فاطمی اپنے قافلہ کے ساتھ جمیلہ کے گھر روانہ ہوئے اور وہاں پر ان کے خاندان والوں سے ملاقات کی۔ اور یہاں سے اب ان کا قافلہ سیر وتفریح کے لیے آگے روانہ ہوا۔ تبھی تو علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''والد صاحب نے بتایا کہ ان کے محلے میں ہی وزیر اعظم کا گھر ہے۔ وہ اکثر صبح کی چہل قدمی میں مل بھی جاتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی اس پر بولے یہاں حیرت کی بات نہیں۔ یہاں سب ایسے ہی ہے کوئی فرق نہیں۔ سب کچھ صاف ستھرا ہے۔ یہاں تک کہ بوتل کے پانی اور عام پانی میں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ عام انسان اور وزیر اعظم میں زیادہ فرق نہیں۔'' (۹۴)

سفرنامہ نگار نے یہ بھی بتایا کہ ماریشس میں جانور نہ کے برابر ہے یہاں تک کہ سانپ، بچھو بھی نہیں ہے۔ علی

احمد فاطمی نے آگے اس سفرنامے میں گنگا تالاب کا بھی ذکر کیا ہے جو ہندوستان کی گنگا ندی کے طرز پر بنایا گیا ہے۔ بالکل ہندوستانی انداز کے مندر، گھنٹی، مورتی، ٹونے ٹوٹکے اور پورا اسی طرح کا ماحول جیسے ہندوستان میں ایسے مقامات پر ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا کہ یہاں کھانے کی زیادہ تر اشیا نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے آتی ہیں۔ ماریشس بھی مشرقی نژاد ملک ہے لیکن وہاں کا معاشرہ مغربی ہے۔

اگلے صفحے میں علی احمد فاطمی اپنے قافلہ اور عبدالرؤف بندھن کے ساتھ کھانے پر تشریف لے گئے، جس کا ذکر انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ علی احمد فاطمی آگے ڈاکٹر آصف علی محمد سے ملنے کے بعد مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ دیکھنے گئے جہاں صابر گوڈر نے استقبال کیا۔ اس کے بعد صابر صاحب نے انسٹی ٹیوٹ یعنی لائبریری، میوزیم اور دیگر عمارتیں وغیرہ دیکھائی جسے دیکھ کر علی احمد فاطمی متاثر ہوئے۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں کہ ہندوستان سے جانے والوں میں سب سے زیادہ تعداد میں لوگ بہار اور اُڑیسہ سے آئے ہے۔ ماریشس یونیورسٹی میں اردو کے علاوہ ہندی، سنسکرت، مراٹھی، تلگو اور تامل بھی پڑھائی جاتی ہے۔

علی احمد فاطمی بڑی ہی تیزی سے ماریشس کی سیر کراتے ہوئے اور اس کی جزئیات نگاری کو بیان کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں، جس سے ماریشس سے لاعلم قاری بھرپور علم حاصل کر سکے۔ انھوں نے اس میں پورٹ لوئس شہر کا ذکر کیا ہے۔ اور آگے اسلامیک کلچر سینٹر جانے کا ذکر کیا ہے، جہاں ان کی ملاقات طاہر صاحب سے ہوئی اور اسلامک کلچر سینٹر کی تاریخ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ علی احمد فاطمی ماریشس کے ایک سمندر کی منظر کشی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہاں رونق زیادہ تھی۔ نیم برہنہ مرد و عورت کچھ پانی میں کچھ بالوں کی سطح پر لیٹے اپنے آپ کو گرمی پہنچا رہے تھے۔ یہاں کچھ کبوتر بھی نظر آ رہے تھے اور کچھ کبوتریاں بھی۔ انسانوں کی تقلید میں پر پھیلائے بالو میں دھنسی ہوئی تھیں۔ ہمارے نزدیک پہنچتے ہی وہ کبوتر کبوتریاں شرما کر پھُر سے اُڑ گئیں لیکن انسانی شکل کی کبوتریاں اسی برہنگی اور بے شرمی کے ساتھ لیٹی اور لپٹی رہیں۔'' (۹۵)

علی احمد فاطمی کا یہ خاصہ ہے کہ اس طرح کے مناظر کے بغیر ان کا کوئی بھی سفرنامہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ انھوں نے اس اقتباس میں کبوتر اور کبوتری کو علامت کے طور پر بیان کیا ہے اور انھیں مشرقی تہذیب کا پروردہ قرار دیا ہے۔ علی احمد فاطمی آگے سیر و تفریح کے دوران ماریشس میں بارش کے موسم کی منظر کشی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دو پہاڑوں اور وادیوں میں بارش کے قطرے موتیوں کی چادر کی طرح نظر آ رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ موتیوں کی ایک جھالا ہے، جسے قدرت نے بڑے سلیقہ اور نفاست کے ساتھ سرزمین ماریشس پر بچھا دیا ہے۔ وہ بھیگے ہوئے درخت سمٹی ہوئی شرمیلی دلہن کی طرح لگے۔ مجھے انسانوں سے زیادہ تو یہ درخت اچھے اور مہذب لگے۔'' (۹۶)

سفرنامہ نگار نے ماریشس کے موسم، بارش، درختوں، اور وہاں کے مناظر فطرت کا بیان نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ علی احمد فاطمی کا خاص اسلوب یہ ہے کہ جس شہر یا علاقے میں وہ پہنچتے ہیں وہاں کی ہر چھوٹی بڑی چیز کا قریب سے جائزہ لیتے ہیں۔ خوبیوں اور خامیوں کو جانچتے ہیں جو بھی خوبی نظر آتی ہے اس کو بلا جھجک قبول کرتے ہیں اور اہل وطن وملت کو اسے اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

علی احمد فاطمی کا یہ سفرنامہ مختصر ہے لیکن انھوں نے اس کے باوجود تمام جزئیات کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ چند روز کے قیام میں ایک سفرنامہ نگار کیا لکھے گا۔ وہ تو نئی جگہ سے ہی مرعوب ہو جائے گا لیکن علی احمد فاطمی مرعوب ہوئے بغیر اپنے قلم کے زور پر زیادہ تر تفصیلات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ سفرنامہ خوشبو کی لہر کی طرح ذہن وفکر پر مسلط ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

علی احمد فاطمی کے اس سفرنامے کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی موصوف کے ہم سفر ہیں۔ انہوں نے اس سفرنامے کی روداد کو عمدہ پیرائے میں سادہ اور سلیس نثر میں پیش کیا ہے۔ اس سفرنامے کے مطالعے سے ماریشس میں اردو کی صورتِ حال کا پتہ چلتا ہے اور قاری بھی ماریشس دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی احمد فاطمی کا یہ سفرنامہ بھی سفرنامہ ورپورتاژ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں تین روز کی کانفرنس کی روداد کو درج کیا گیا ہے، جو رپورتاژ کا اہم عنصر ہے۔

علی احمد فاطمی نے آج کے دور میں ترقی پسند نقاد ہوتے ہوئے بھی سفرنامے لکھے۔ انہوں نے اب تک پانچ (۵) سفرنامے تخلیق کیے ہیں جن میں ''سفر ہے شرط'' اور ''سات سمندر پار'' کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ علی احمد فاطمی کے سفرناموں میں دلچسپ واقعات اور ذاتی تاثرات ہونے کی وجہ سے افسانے اور ناول سا لطف پیدا ہوتا ہے۔

علی احمد فاطمی جہاں بھی جاتے ہیں سب سے پہلے وہاں کی تاریخ ،جغرافیائی حالات اور لوگوں کے کردار کی بات سے ابتداء کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ عورتوں کے برہنہ جسموں کا بیان اور پھر ملک کے معاشی ،اقتصادی اور سماجی حالات وغیرہ کا بیان جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی اپنے سفرناموں میں ان ملکوں کی تہذیب وتمدن کو بھی پیش کرتے ہیں۔اوروہ واقعات کے انتخاب میں ماہر ہیں۔Unique واقعات کا انتخاب کرتے ہیں جس سے سفرنامہ جیسی صنف کو بھی تقویت ملے۔

علی احمد فاطمی نے اپنے سفرناموں میں لندن، جرمنی اور کنیڈا وغیرہ ملکوں میں عورتوں اور مردوں کے درمیان باہم جو اختلاط اور کھلا پن دیکھا ،اس کو بڑے ہی مزاحیہ انداز میں طنز کے ساتھ اپنے سفرناموں میں پیش کیا ہے۔علی احمد فاطمی جہاں بھی جاتے ہیں وہاں کی صاف صفائی کے ساتھ جرائم اور بازاروں کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور محنت کش قوموں کی تعریف بھی خوب کرتے ہیں۔اوران سے ہندوستانی قوم خاص طور سے مسلمانوں کا تقابل بھی کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی کے یہاں علامتی اندازِ بیان اور طنزیہ لب ولہجہ ملتا ہے،مگرحسن بیانی اورخوش اسلوبی کے ساتھ اپنی بات قاری تک پہنچانے میں ماہر ہیں ساتھ ہی وہ تخلیقی زبان کا استعمال فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔

علی احمد فاطمی نے اپنے تمام اسفار ادبی انجمنوں اور دوستوں کی دعوتوں پر کیا ہے اور یہ دعوتیں بھی ادبی نوعیت کی ہوتی تھیں۔اس لیے ان کے سفرناموں میں ادبی شخصیات ،تقریبات ،لائبریری اور کتب وغیرہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ساتھ ہی قاری کو ایک جہاں دیگری کی سیر بھی کرائی گئی ہے۔یہ تمام سفر ہنگامی نوعیت کے تھے،اس لیے وہ سیاح کے بجائے مسافر نظر آتے ہیں اور جب بھی سیاحی کی فرصت ملی تو ان کے اندر کا سیاح بیدار ہوا۔اور پھر وہ ہر چیز سے بے نیاز ہوکر سفر میں لگ جاتے ہیں۔

علی احمد فاطمی کے سفرنامے رپورتاژ کے ہم سایہ نظر آتا ہے اور وہ حقیقی کردار کو افسانے کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔علی احمد فاطمی کے سفرناموں میں لذت وشیرینی زیادہ ہے۔ان کا انشائیہ زبان کا استعمال لطف پیدا کرتا ہے۔علی احمد فاطمی کے سفرناموں کے بعد قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی رومانوی اور وہ بھی حقیقی دنیا سے سفر کر کے آرہا ہے۔

علی احمد فاطمی کے یہ تمام سفرنامے لندن،کنیڈا،تاشقند، جرمنی اور ماریشس کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔اوران

کی فکر ونظر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ان کے سفر ناموں میں ترقی پسندی وحقیقت پیش کرنے کی وجہ اور خاص طور سے عورتوں کے کثرت سے بیان کے سبب کہیں کہیں قاری کو اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔علی احمد فاطمی کے تمام سفر ناموں میں ترقی پسندی غالب نظر آتی ہے۔اس طرح ان کے یہ تمام سفر نامے بہت عمدہ ہیں،جس سے اردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ علی احمد فاطمی، سفر ہے شرط (چند باتیں)، فائن آفسٹ پریس الہ آباد، ۱۹۸۰، ص: ۵، ۶

۲۔ ایضاً، ص: ۸

۳۔ علی احمد فاطمی، سفر ہے شرط، فائن آفسٹ پریس الہ آباد، ۱۹۸۶، ص: ۱۳

۴۔ ایضاً، ص: ۱۴، ۱۵

۵۔ ایضاً، ص: ۱۵، ۱۶

۶۔ ایضاً، ص: ۱۶

۷۔ ایضاً، ص: ۱۶

۸۔ ایضاً، ص: ۲۵

۹۔ ایضاً، ص: ۲۷، ۲۸

۱۰۔ ایضاً، ص: ۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص: ۳۴

۱۲۔ ایضاً، ص: ۳۹، ۴۰

۱۳۔ ایضاً، ص: ۴۱

۱۴۔ ایضاً، ص: ۵۸، ۵۹

۱۵۔ ایضاً، ص: ۵۹

۱۶۔ ایضاً، ص: ۶۲، ۶۳

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۱۰، ۱۱۱

۱۸۔ ایضاً، ص: ۱۳۱

۱۹۔ ایضاً، ص: ۱۳۹

۲۰۔ ایضاً،ص: ۱۴۴،۱۴۵

۲۱۔ ایضاً،ص: ۱۴۸

۲۲۔ ایضاً،ص: ۱۴۹

۲۳۔ ایضاً،ص: ۱۵۰

۲۴۔ ایضاً،ص: ۱۶۵،۱۶۶

۲۵۔ ایضاً،ص: ۱۸۰

۲۶۔ ایضاً،ص: ۱۸۷

۲۷۔ علی احمد فاطمی،سات سمندر پار(ابتدائیہ)،سرسوتی آفسٹ پریس الہ آباد،۲۰۰۳،ص: ۵

۲۸۔ ایضاً،ص: ۵،۶

۲۹۔ علی احمد فاطمی،سات سمندر پار(کنیڈا میں چند روز)،سرسوتی آفسٹ پریس الہ آباد،۲۰۰۳،ص: ۱۲

۳۰۔ ایضاً،ص: ۱۶

۳۱۔ ایضاً،ص: ۱۸

۳۲۔ ایضاً،ص: ۱۹

۳۳۔ ایضاً،ص: ۱۹،۲۰

۳۴۔ ایضاً،ص: ۲۰

۳۵۔ ایضاً،ص: ۲۸

۳۶۔ ایضاً،ص: ۲۹

۳۷۔ ایضاً،ص: ۳۳

۳۸۔ ایضاً،ص: ۳۷،۳۸

۳۹۔ ایضاً،ص: ۴۹

۴۰۔ ایضاً،ص: ۵۱

۴۱۔ ایضاً،ص: ۶۰

۴۲۔ ایضاً،ص: ۷۳،۷۴

۴۳۔ ایضاً،ص: ۷۵

۴۴۔ ایضاً،ص: ۷۷

۴۵۔ علی احمد فاطمی، سات سمندر پار ''یہ انوکھا دیار ہے یارو'' (تاشقند میں چند روز)، سرسوتی آفسٹ پریس الہ آباد، ۲۰۰۳،ص: ۸۵

۴۶۔ ایضاً،ص: ۸۹

۴۷۔ ایضاً،ص: ۹۱

۴۸۔ ایضاً،ص: ۹۲

۴۹۔ ایضاً،ص: ۹۶

۵۰۔ ایضاً،ص: ۹۷

۵۱۔ ایضاً،ص: ۹۹،۱۰۰

۵۲۔ ایضاً،ص: ۱۰۰

۵۳۔ ایضاً،ص: ۱۱۰

۵۴۔ ایضاً،ص: ۱۲۴،۱۲۵

۵۵۔ ایضاً،ص: ۱۲۶،۱۲۷

۵۶۔ ایضاً،ص: ۱۳۵،۱۳۶

۵۷۔ ایضاً،ص: ۱۳۹

۵۸۔ ایضاً،ص: ۱۴۷،۱۴۸

۵۹۔ ایضاً،ص: ۱۵۱

۶۰۔ ایضاً،ص: ۱۵۳

۶۱۔ ایضاً،ص: ۱۵۴

۶۲۔ علی احمد فاطمی، جرمنی میں دس روز (دو باتیں)، راجیو آفسیٹ الہ آباد، ۲۰۰۷،ص:۴

۶۳۔ علی احمد فاطمی، جرمنی میں دس روز، راجیو آفسیٹ الہ آباد، ۲۰۰۷،ص: ۱۰

۶۴۔ ایضاً،ص: ۱۴،۱۳

۶۵۔ ایضاً،ص: ۲۳

۶۶۔ ایضاً،ص: ۱۴

۶۷۔ ایضاً،ص: ۲۲،۲۱

۶۸۔ ایضاً،ص: ۲۸

۶۹۔ ایضاً،ص: ۳۲،۳۱

۷۰۔ ایضاً،ص: ۳۲

۷۱۔ ایضاً،ص: ۳۹

۷۲۔ ایضاً،ص: ۴۰

۷۳۔ ایضاً،ص: ۴۸

۷۴۔ ایضاً،ص: ۴۸

۷۵۔ ایضاً،ص: ۵۰

۷۶۔ ایضاً،ص: ۵۳

۷۷۔ ایضاً،ص: ۶۱

۷۸۔ ایضاً،ص: ۶۵

۷۹۔ ایضاً،ص: ۶۶،۶۵

۸۰۔ ایضاً،ص: ۶۷،۶۶

۸۱۔ ایضاً،ص: ۶۷

۸۲۔ ایضاً،ص: ۷۳

۸۳۔ ایضاً،ص: ۷۹

۸۴۔ ایضاً،ص: ۱۷

۸۵۔ ایضاً،ص: ۸۳

۸۶۔ پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، اردو کا عالمی تناظر (ماریشس میں اردو)، براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۷، ص: ۲۰۸

۸۷۔ ایضاً،ص: ۲۱۰

۸۸۔ ایضاً،ص: ۲۱۲،۲۱۱

۸۹۔ ایضاً،ص: ۲۱۲

۹۰۔ ایضاً،ص: ۲۳۱،۲۳۰

۹۲۔ ایضاً،ص: ۲۴۰

۹۲۔ ایضاً،ص: ۲۴۱

۹۳۔ ایضاً،ص: ۲۴۱

۹۴۔ ایضاً،ص: ۲۴۳

۵۹۔ ایضاً،ص: ۲۵۴

۶۹۔ ایضاً،ص: ۲۵۵

☆☆☆

ماحصل

ماحصل

اردو سفر نامے نے ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد صنف ادب میں اپنا ایک خاص مقام حاصل کرلیا ہے۔ موجودہ دور میں سفر نامہ ایک قابل قدر اور مقبول صنف ہے۔ سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے، اس میں مصنف مختلف مقامات کے حالات، درپیش آئے واقعات، تہذیب و معاشرت، رسم و رواج اور متعلقہ عہد کی تاریخ کو بھی ذاتی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں بیان کرتا ہے۔ دورانِ سفر مسافر حیرت و استعجاب، جدید انکشافات اور نئے تجربے سے دوچار ہوتا ہے اور سفر نامے میں ان سب کا بیان کر کے قاری کے علم کی توسیع بھی کرتا ہے۔

دورانِ مطالعہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سفر نامے میں مختلف النوع موضوعات و مضامین کی شمولیت ہوتی ہے مثلاً اس میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، طب، سیاست، زبان و ادب اور دیگر علوم و فنون پر سفر نامہ نگار ادبی لب و لہجہ میں اظہار خیال پیش کرتا ہے۔ ایک طرف سفر ''وسیلۂ ظفر'' ہے تو دوسری طرف ''کامیابی کی کنجی''۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سفر شرط ہے۔ روزِ اوّل سے انسانوں کا سفر جاری ہے، کائنات کی ہر شئے سفر میں ہے اور آج سفر کرنا ہماری زندگی کی ایک اہم ضرورت بن گیا ہے۔ غرض کہ جس طرح ہماری زندگی میں سفر کی ضرورت و اہمیت ہے اسی طرح صنف سفر نامہ کی بھی ہمارے ادب میں اہمیت اور ضرورت ہے۔ سفر نامہ کی ضرورت اور مقبولیت کی وجہ ہے کہ اردو میں بے شمار سفر نامے لکھے گئے اور آج بھی سفر نامے نہ صرف لکھے جا رہے بلکہ ذوق و شوق سے پڑھے بھی جا رہے ہیں۔ آج اردو سفر ناموں کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس صنف نے اردو ادب میں نہ صرف ایک مقام بنایا بلکہ اپنی اہمیت کا لوہا بھی منوایا ہے۔

سفر نامہ نہ صرف انسان کو معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ شوق و سیاحت کے جذبے کو فروغ بھی دیتا ہے۔ جس طرح ناول پڑھنے کے بعد ہمیں زندگی کے کسی مسئلے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے یا زندگی کے بارے میں ہمارا نظریہ واضح ہوتا

ہے اسی طرح سفرنامے سے ہمیں زندگی کی نیرنگی اور سفرنامہ نگار کے مشاہدات و تجربات کے علاوہ ادبی، علمی، تاریخی و جغرافیائی حالات سے بھی واقفیت ہوتی ہے۔ سفرنامے میں مختلف مقامات کی تاریخ، تہذیب و تمدن، عادات و اطوار، رسوم و رواج اور مختلف علوم کا ایک خزانہ ہوتا ہے، جسے سفرنامہ نگار اپنے حسین تاثرات اور دلکش احساسات کے ساتھ خوشگوار انداز میں رقم کرتا ہے۔ سفرنامہ سفر کا ایک یادگار البم ہوتا ہے، جس میں جامد اور ساکت مناظر کی تصاویر آویزاں نہیں ہوتیں بلکہ سیاحت کے مقامات کی خوشگوار اور جان دار تصویریں ہوتی ہیں۔ سفرنامہ نگار اپنے تخلیقی جوہر سے اس طرح سجا کر پیش کرتا ہے کہ سفرنامہ جذبات و احساسات کے ایک حسین دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

زیرِ نظر مقالے میں علی احمد فاطمی کی حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ نیز سفرنامہ کے معنی و مفاہیم کی وضاحت کے علاوہ سفرنامے کی تاریخ اور روایت کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

باب اوّل علی احمد فاطمی کی حیات، شخصیت اور کارنامے سے متعلق ہے، جس میں ان کے آباء واجداد، والدین، ولادت، بچپن اور تعلیم و تربیت، شادی، ملازمت، تصانیف اور ان کی سیرت و شخصیت وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب دوم میں سفرناموں کی روایت کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی اس باب میں سفرنامے کے فن پر بحث کرتے ہوئے اس کی تعریف، بنیادی عناصر، اغراض و مقاصد، اہمیت و افادیت اور ادبی قدر و قیمت کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ باب سوم میں علی احمد فاطمی کے سفرناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، جس میں ان کے فنی و فکری اوصاف کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں ماحصل کے طور پر مجموعی جائزہ پیش کرنے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اس کے بعد ان کتب و رسائل کی فہرست دی گئی ہے، جن کے زیرِ نظر مقالے کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔

جدید اردو سفرنامہ نگاروں میں علی احمد فاطمی محتاج تعارف نہیں، حالانکہ اردو ادب میں ان کی شناخت ایک ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے ہے۔ علی احمد فاطمی طالب علمی کے زمانے ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے ادب کو زندگی کا ترجمان تسلیم کیا۔ علی احمد فاطمی کا ماننا ہے کہ کوئی بھی ادب سماج سے کٹ کر یا ہٹ کر نہیں لکھا جا سکتا۔ کیوں کہ ادب اور سماج کا گہرا رشتہ ہے۔ علی احمد فاطمی کی ادبی و تنقیدی تصانیف اور مضامین ہی سے ان کی فکری بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

علی احمد فاطمی نے یوں تو اردو ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا اصل میدان تنقید ہے۔ انہوں

نے تنقید کے علاوہ غیر افسانوی نثر افسانہ، ڈرامہ، سفرنامہ، خاکہ، رپورتاژ، اور مضمون نگاری وغیرہ میں اپنے قلم کا جوہر آزمایا ہے۔

علی احمد فاطمی کے جملہ پانچ سفرنامے ہیں، جنھیں چار (۴) مختلف کتابوں کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ (۱) ''سفر ہے شرط'' ۱۹۸۶ء (۲) ''سات سمندر پار'' ۲۰۰۳ء (۳) ''جرمنی میں دس روز'' ۲۰۰۷ء اور (۴) ''ماریشس میں چند روز'' آخرالذکر سفرنامہ فروری تا جون/ ۲۰۱۶ء کو ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد میں قسط وار شائع ہوا جبکہ اسی سفرنامے کو پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنی تصنیف ''اردو کا عالمی تناظر'' میں ''ماریشس میں اردو'' کے عنوان سے ۲۰۱۷ء میں براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی سے شائع کیا۔

علی احمد فاطمی کے سفرناموں پر مبنی کل چار کتابیں ہیں جب کہ جملہ سفرناموں کی تعداد پانچ (۵) ہے۔ ''سات سمندر پار'' نامی مجموعے میں دو سفرناموں ''کنیڈا میں چند روز'' اور ''یہ انوکھا دیار ہے یارو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ ان کے سفرنامے نہایت دلچسپ، ادبی ذوق سے ہم آہنگ اور معلوماتی نوعیت کے ہیں۔ علی احمد فاطمی کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ وجوہاتِ سفر اور شرکاءِ سفر کا بھی ذکر اپنے سفرناموں میں نہایت تفصیل سے کرتے ہیں۔ اور وہ اپنے سفرنامے میں جگہ جگہ علامت کے طور پر مصنوعی چیزوں کو حقیقی چیزوں میں بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علی احمد فاطمی کے سفرنامے ادبی نوعیت کے ساتھ ساتھ معلومات کا خزانہ بھی ہیں۔

انھوں نے دنیا کے کئی ممالک کا سفر کیا اور اپنے کچھ سفر کے احوال کو قلم بند بھی کیا ہے۔ وہ اپنے سفرناموں میں کہیں ایک ماہر ادیب کی طرح الفاظ کے دریا بہاتے ہیں تو کہیں ایک نقاد کی طرح کسی قوم کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ وہ خوبیوں کو سراہتے اور خامیوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ علی احمد فاطمی اپنی قوم و ملت کو ان کی خوبیاں اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں اور خامیوں سے بچنے کا پیغام بھی سناتے ہیں۔

علی احمد فاطمی ایک کثیر الاسفار اور بڑے سفرنامہ نگار ہیں۔ ان کے سفرنامے اردو کے غیر افسانوی صنفِ ادب میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء سے سفرنامہ لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ علی احمد فاطمی نے جب ۱۹۸۵ء میں سفرنامہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت اردو سفرنامہ تقریباً ۱۵۰/ برسوں کا سفر طے کر چکا تھا، جو کسی بھی صنف کی مقبولیت کا ایک واضح ثبوت ہے۔

''سفر نامہ'' اردو کے غیر افسانوی ادب کی وہ صنف ہے، جس کے لیے کوئی خاص تکنیک، اجزائے ترکیبی یا اسلوب مقرر نہیں ہیں۔ سبھی سفر نامہ نگاروں نے اپنے اسلوب اور تکنیک کے مطابق سفر نامہ رقم کیا ہے۔ علی احمد فاطمی کا بھی اسلوب قدیم سفر نامہ نگاروں سے ملتا جلتا ہے۔ ان کے سفر نامے سماجی، تاریخی، واقعاتی اور جغرافیائی معلومات سے پُر ہیں۔ علی احمد فاطمی نے اپنی ترقی پسندانہ سوچ وفکر کی وجہ سے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور اس کو مقبولیت کے عروج پر پہنچانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔

علی احمد فاطمی نے اپنے سفر کسی نہ کسی مقصد کے تحت کیے ہیں۔ وہ ایک ترقی پسند، بے باک مقرر اور ایک فعال ومتحرک ادیب ونقاد بھی ہیں۔ اسی لیے انہیں مختلف انجمنوں اور یونیورسٹیوں کی علمی دعوت وقفہ وقفہ پر ملتی رہی ہے، جس کے باعث انہیں مختلف مقامات کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ اور ان ہی اسفار کی روداد، واقعات اور تجربات ومشاہدات کو انہوں نے اپنے سفر ناموں میں قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ۴۰ رسالہ ادبی سفر میں لندن، پیرس، تاشقند، کنیڈا، ٹورنٹو، جرمنی، پاکستان اور ماریشس جیسے ممالک کا سفر کانفرنسوں اور سیمناروں میں شرکت کی غرض سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونی ممالک میں اردو طبقہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہے۔

علی احمد فاطمی دور حاضر کے ایک اہم سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کے سفر ناموں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ وجغرافیہ کا پُر فریب منظر، بیان کا ربط، واقعات کا تسلسل، معاشرت کا حسین بیان اور آج کے مشینی آلات کی دلکش عکاسی نے ان کے سفر ناموں کو ایک الگ مظہر عطا کیا ہے۔

پروفیسر احتشام حسین کا سفر نامہ ''ساحل اور سمندر'' اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز اور ایک نئی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ علی احمد فاطمی نے اسی روایت کو اپنے سفر ناموں میں مزید تقویت بخشی ہے۔ علی احمد فاطمی مارکسی نظریے کے حامل نقاد ہیں۔ ان کے سفر نامے میں مارکسی نقطۂ نظر کی تمام جزئیات جا بجا نظر آتی ہیں۔

ان کے سفر ناموں میں زبان کی پختگی، دلکش اسلوب، واقعات کی ترتیب، جزئیات نگاری اور جا بجا منظر کشی کا بہترین نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ چست فقرے، دلچسپ مثالیں اور مناسب الفاظ کے استعمال ان کے سفر ناموں کو منفرد شناخت عطا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں آزادانہ طور پر احساسات وجذبات اور مشاہدات وتجربات کو شگفتہ ولطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں ملنے جلنے اور مہمان نوازی کا بیان کثرت سے نظر آتا ہے یا

یوں کہئے کہ اخلاقیات کا عنصر غالب ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ جب میں نے سفر نامہ لکھنا شروع کیا تو اس وقت وہ سفر نامہ اور رپورتاژ کی جزئیات سے واقف نہیں تھے۔

علی احمد فاطمی اپنے سفر ناموں میں سفر کے واقعات کو ادبیت کے لبادے میں پیش کرتے ہیں۔ حسن و جمال کا شائق ہر شخص ہوتا ہے لیکن علی احمد فاطمی اس سے کچھ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں نسائی کردار اور ان کے حسن و جمال کا ذکر بار ہا ملتا ہے۔

وہ عورت کو اپنے سفر ناموں میں ایک خاص مقام دیتے ہیں۔ انہیں کبھی کوئی عورت اپنے اخراجات کے لیے کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے، تو کوئی عورت میوے اور سبزیاں بیچتے ہوئے، تو کہیں برقی بسوں کی ڈرائیوری اور کنڈکٹری کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، جس کو انھوں نے اپنے سفر نامے میں اہم مقام عطا کیا ہے۔

علی احمد فاطمی کے سفر نامے پڑھتے ہوئے جہاں مسرت کا احساس ہوتا ہے وہیں سنجیدگی سے ہمیں مختلف ممالک کے مسائل اور حالات سے بھرپور شناسائی بھی ہوتی ہے۔ بیرونی ممالک کی تہذیب و معاشرت، وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار، رہن سہن، لباس اور غذا کے علاوہ اخلاق و آداب اور سیرت و کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں لندن، کنیڈا، تاشقند، جرمنی اور ماریشس کی مختلف ایجادات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اور انہوں نے مختلف ممالک کی ثقافت اور سائنسی ترقی کا تذکرہ کر کے ہندوستان کی سیاست اور حکومت پر کاری ضرب بھی لگائی ہے۔ ان کے سفر ناموں میں ترقی پسندانہ عنصر غالب نظر آتا ہے۔

علی احمد فاطمی کے سفر ناموں میں رپورتاژ کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ طرزِ انشائیہ اور پر لطف زبان ان کے سفر ناموں کو قاری کے قریب تر کرتی ہے۔ وہ حقیقی کردار کو افسانے کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

علی احمد فاطمی کے یہاں علامتی اندازِ بیان اور طنزیہ لب و لہجہ بھی ملتا ہے، وہ تخلیقی زبان کا استعمال فنکارانہ انداز میں کرتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں کی زبان سادہ اور سلیس ہے، جسے قاری بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ علی احمد فاطمی کے سفر نامے کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی موصوف کے ہم سفر ہیں۔

درج بالا خصوصیات کے مدنظر ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ علی احمد فاطمی نے اپنے سفر ناموں کے ذریعے نہ صرف اردو سفر نامے کی روایت کو جلا بخشی ہے بلکہ اردو ادب میں عمدہ اور بہترین سفر نامے تحریر کر کے سفر نامے کے میدان

کومزید وسعت بخشی ہے۔ بلاشبہ علی احمد فاطمی عصر حاضر کے ایک اہم سفر نامہ نگار ہیں، جن کی اہمیت وافادیت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

کتابیات

بنیادی کتابیں

نمبر شمار	مصنف/مرتب	کتاب	مطبع/ناشر	سنہ اشاعت
۱)	علی احمد فاطمی، پروفیسر	سفر ہے شرط	فائن آفسٹ پریس، الہ آباد	۱۹۸۶
۲)	علی احمد فاطمی، پروفیسر	دو ترقی پسند شاعر: علی سردار جعفری، مجروح سلطانپوری	سرسوتی آفیسٹ پریس، الہ آباد	۲۰۰۰
۳)	علی احمد فاطمی، پروفیسر	سات سمندر پار	سرسوتی آفسٹ ورکس، الہ آباد	۲۰۰۳
۴)	علی احمد فاطمی، پروفیسر	جرمنی میں دس روز	راجیو آفسٹ پریس، الہ آبا	۲۰۰۷
۵)	علی احمد فاطمی، پروفیسر	سید احتشام حسین: ذکر و فکر	رجحان پبلیکیشنز، کریلی، الہ آباد	۲۰۱۳
۶)	علی احمد فاطمی، پروفیسر	ماریشس میں چند روز	ماہنامہ سب رس، حیدر آباد (دکن)	۲۰۱۶
۷)	علی احمد فاطمی، پروفیسر	فن اور فنکار (شخصیت نامے)	الہ آباد	۲۰۲۱

معاون کتب

نمبر شمار	مصنف/مرتب	کتاب	مطبع/ناشر	سنہ اشاعت
۱)	ابن کنول، پروفیسر	کچھ سگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے)	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۲۰
۲)	احتشام حسین سید، پروفیسر	ساحل اور سمندر	سرفراز قومی پریس لکھنؤ	۱۹۵۴
۳)	احسن مارہروی	نمونہ منشورات	قومی کونسل برائے اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۱
۴)	انور سدید، ڈاکٹر	اردو ادب کی مختصر تاریخ	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۹۱

۵)	انور سدید، ڈاکٹر	اردو ادب میں سفر نامہ	ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۱۱
۶)	تنویر احمد علوی، ڈاکٹر	سفر ناموں میں دہلی	اردو اکادمی، دہلی	۲۰۱۲
۷)	حامد حسن قادری	داستان تاریخ اردو	اے۔بی۔سی۔آفسٹ پرنٹرز، دہلی	۲۰۰۷
۸)	خالد محمود، ڈاکٹر	اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۲۰۱۱
۹)	خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر	اردو سفر ناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت	قومی کونسل برائے اردو زبان نئی، دہلی	۲۰۱۳
۱۰)	خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر	اردو کا عالمی تناظر	براؤن پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۷
۱۱)	ذولفقار علی احسن	آزادی کے بعد اردو سفر نامے میں جنس نگاری کا رجحان	اردو اکادمی، لاہور	۲۰۰۸
۱۲)	سعید احمد	آزادی کے بعد اردو سفر نامہ	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۲
۱۳)	سلیم اختر	اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۵
۱۴)	شبیہ صغرا، ڈاکٹر	پروفیسر فضل امام ادبی سفر کے ساٹھ سال	امپریشن پرنٹ ہاؤس، لکھنؤ	۲۰۱۵
۱۵)	عبدالصمد	دوستوں کا دوست (خاکہ)	ماہنامہ سب رس، حیدرآباد (دکن)	
۱۶)	غضنفر	سرخ رو	ایس۔ایچ۔آفیسٹ پرنٹرس، دہلی	۲۰۱۰
۱۷)	قدسیہ قریشی، ڈاکٹر	اردو سفر نامے انیسویں صدی میں	نصرت پبلیشنز، لکھنؤ	۱۹۸۷
۱۸)	قطب النساء ہاشمی	تین مسافر	نیشنل پرنٹرز، حیدرآباد (دکن)	۱۹۴۶
۱۹)	گوپی چند نارنگ	بیسویں صدی میں اردو ادب	ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	۲۰۰۲
۲۰)	محبوب الرحمٰن فاروقی/ ابرار رحمانی	آج کل اور سفر نامہ	پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند	۲۰۰۰
۲۱)	محمد مجاہد علی قاسمی، مفتی	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی: بحیثیت سفر نامہ نگار	مکتبہ عزیزیہ، حیدرآباد	۲۰۱۰
۲۲)	محمد حماد کریمی ندوی	یادحرم	مکتبہ الحمد العلمیہ مجلس صحافت ونشریات	۲۰۱۴

			مظفر پور، بہار	
۲۳)	محمد شہاب الدین	اردو میں حج کے سفرنامے	یونی ورسل بک ہاؤس، علی گڑھ	
۲۴)	محمد عقیل رضوی سید، پروفیسر	لندن اولندن	نشات آفسیٹ پریس، ٹانڈہ	۱۹۸۷
۲۵)	مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر	اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ	اورنیٹ پبلی کیشنز، لاہور	۲۰۱۴
۲۶)	مظہر احمد، ڈاکٹر	تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ	ایم۔آر۔پبلیکیشنز، نئی دہلی	۲۰۱۲
۲۷)	یوسف کمبل پوش	عجائبات فرنگ (تاریخ یوسفی)	مکتبہ نول کشور، لکھنؤ	۱۸۷۳
۲۸)	یوسف کمبل پوش/ تحسین فراقی	عجائباتِ فرنگ	لاہور	۱۹۸۴

اخبار و رسائل

۱)	آج کل	دہلی
۲)	اردو ادب	نئی دہلی
۳)	اردو دنیا	نئی دہلی
۴)	انشاء	کلکتہ
۵)	تہذیب الاخلاق	علی گڑھ
۶)	جہان غالب	نئی دہلی
۷)	جہان اردو	دربھنگا
۸)	سائنس	نئی دہلی
۹)	سب رس	حیدرآباد
۱۰)	سبقِ اردو	بھدوہی

۱۱)	شب خون	الہ آباد
۱۲)	شگوفہ	حیدرآباد
۱۳)	شاعر	ممبئی
۱۴)	فکروتحقیق	نئی دہلی
۱۵)	فکرونظر	علی گڑھ
۱۶)	فروغ اردو	لکھنؤ
۱۷)	کتاب نما	نئی دہلی
۱۸)	کاروان ادب	بھوپال
۱۹)	نگار	لکھنؤ
۲۰)	نیادور	لکھنؤ
۲۱)	نقوش	کراچی
۲۲)	نوائے ادب	ممبئی
۲۳)	معاصر	پٹنہ
۲۴)	ہماری زبان (ہفت روزہ)	دہلی / علی گڑھ
۲۵)	انقلاب (روزنامہ)	
۲۶)	راشٹری سہارا (روزنامہ)	
۲۷)	منصف (روزنامہ)	حیدرآباد
۲۸)	سیاست (روزنامہ)	حیدرآباد
۲۹)	امراجالا (ہندی)	
۳۰)	دینک جاگرن (ہندی)	
۳۱)	ہندوستان (ہندی)	

ویب سائٹ

۱) https:www.rekhta.org

۲) https:www.shodhganga.com

۳) https:www.jadeedadab.com

۴) https:www.urdu point.com

۵) https:www.urdu books.com

۶) https:www.pdfbooks free.com

۷) https:www.urdu council.in

۸) https:www.urdudost.com

۹) https:www.bookmaza.com

۱۰) https:www.ncpulblog.com

☆☆☆